اکبر الٰہ آبادی کا سیاسی شعور

ارشاد حسین نقوی

ذخیرہ کتب: محمد احمد ترازی

اکبر الٰہ آبادی کا

سیاسی شعور

ارشاد حسین نقوی
ایم، اے، پی۔ ای۔ ایس (I)
شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج پتوکی

الحمرا اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر ۴۹۷
ایبک روڈ، انارکلی، لاہور

ناشر ———— الحمرا اکیڈمی ایبک روڈ - لاہور
تعداد ———— ۵۰۰ (پانچسو)
مطبع ———— کاروان پریس لاہور
باراول ———— ۱۹۷۴ء

قیمت ۵ روپے

سلسلۂ مطبوعات
۱۹

آئینۂ ترتیب



نام ——— سید ارشاد حسین نقوی

تعلیم ——— ایم اے (اردو) سند لسانیات (بنگالی)

مشغلہ ——— لیکچرر شعبہ اردو

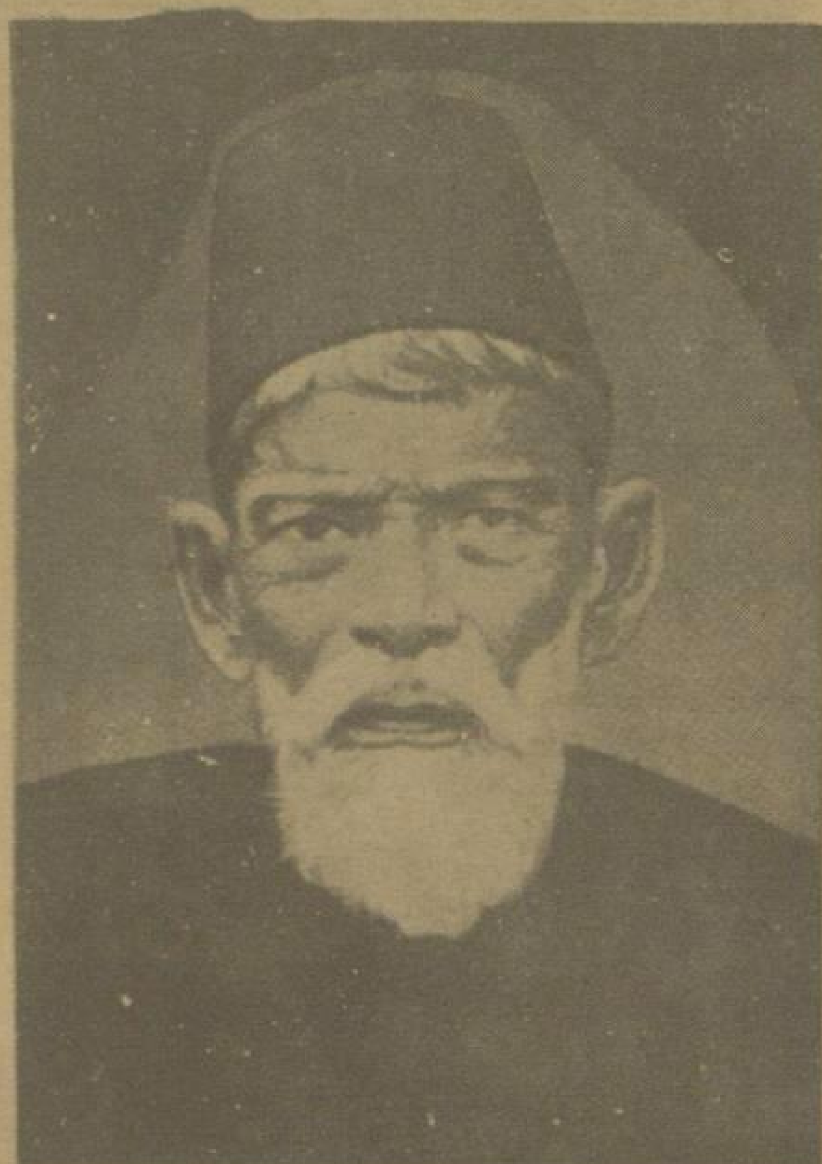
تصانیف ——— برطانوی دستور ۱۹۶۴ء

دستوری مطالعہ ۱۹۶۸ء

الحمراورک بک آف اردو گرامر ۱۹۷۰ء

پروین نقوی کے نام

جس نے میرے اذکار کو جِلا بخشی



حرفِ آغاز

اکبر الہ آبادی کے اشعار جب میں نے اپنے دوستوں کی زبانی سُنے تو میرے دل میں یہ تڑپ پیدا ہوئی کہ شاعر کو پڑھا جائے۔ یہی جذبہ مجھے شاعر کے قریب لے آیا۔ مجھے اکبر رجعت پسند نہیں ترقی پسند نظر آئے۔ سیاسی بصیرت سے بے بہرہ نہیں سیاسی شعور کی دولت سے مالا مال نظر آئے

اگر ہماری قومی تحریک آزادی کی جد وجہد اور آزادی پسند قوتوں کے کارہائے نمایاں پر پردہ بھی ڈال دیا جائے تو بھی تحریکِ آزادی سے متعلق پوری تاریخ کلامِ اکبر سے مرتب کی جا سکتی ہے۔

میں نے دو برس تک اکبر کے
کلام اور اکبر سے متعلق ہر اچھی
بری تحریر کو پڑھنے کی کوشش کی
میری تحقیق اسی جستجو کا نتیجہ ہے
اکبر مرحوم کی دلی خواہش تھی کہ جو
کلام قومی جذبہ کی بیداری کے لیے
اردو کے تمام شعرا کا ہے اُسے یکجا
چھاپا جائے اکبر فرماتے ہیں کہ حالی
شبلی اور میں نے خود جو اشعار قوم
کے بارے میں کہے ہیں ان کو یکجا شائع
کیا جائے ۔۔۔ میں یہ کام تو نہیں
کر سکا مگر اکبر کے اشعار سے جو نتائج
اور جو فکری نتائج ہمارے سامنے آئے
ہیں اُس کے بارے میں میں نے حسب
استطاعت کام کیا ہے۔

آخر میں جناب طاہر تونسوی جناب سید [illegible]
اور جناب جابر لودھی، پروفیسر منور مرزا کا بے حد شکر گزار
ہوں کہ انہوں نے میری معاونت فرمائی۔

ارشاد شاکر اعوان
۱/۱۲/۷۲
گورنمنٹ کالج [illegible]

بابِ اوّل

سیاسی و سماجی پس منظر

لسان العصر سیّد اکبر حسینؒ اکبر الٰہ آبادی کو نہ جانے لوگ محض ایک ظریف شاعر یا اودھ پنچ کا قلمی معاون کہہ کر کیوں ٹال دیتے ہیں اس سے اکبر کی شخصیت کا صرف ایک اور وہ بھی دھندلا سا پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیّد اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی نہ صرف قومی شاعر ہیں بلکہ ایک بیباک اور حق گو مبلّغ بھی ہیں انہوں نے نازک سے نازک موقعہ پر بھی کلمۂ حق کہنے سے گریز نہ کیا۔

سیاست دربان سے اکبر ڈر بھی جاتے تھے جیسا کہ ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے لیکن یاد رکھنے کی یہ بات ہے کہ جب اپنی شاعری کا شن اکبر کے سامنے آجاتا۔ تو پھر وہ کہے بغیر نہ رہتے تھے — ؎ [1]

شاگردِ ڈارون تو خدا ہی نے کر دیا
اکبر مگر نہیں ہے مداری کے ہاتھ میں

ظلم واستبداد کے اس دور میں جبکہ بڑے بڑے لوگوں کی آواز گلوگیر دب کر رہ جاتی

---

[1] حیات اکبر، بزم اکبر کراچی ص۱۴۷ — ۱۴۰ قول ! پروفیسر رشید احمد صدیقی

[2] کلیات اکبر مرتبہ ملا واحدی بزم اکبر کراچی

تھی اور لوگ حق کی بات کہنے سے پہلوتہی کرتے تھے اور اگر کہتے بھی تھے تو لاکھ پردوں میں چھپاکر، اکبر نے حق بات کہی اشارہ برتا تو ایسا جسے اشارہ بعید نہ کہا جاسکے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب لکھتے ہیں

" انگریز اور انگریزیت کے طلسم پر پہلی ضرب کاری اکبر نے لگائی اور اس زمانے میں لگائی جبکہ انگریزوں کی سطوت و جبروت کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان کا ذکر کیا، ساری دنیا میں ان سے آنکھ ملانے کی کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی اور اس طرح لگائی کہ پھر اسے پنپنا نصیب نہ ہوا۔"[1]

یہ الگ بات ہے کہ وہ بڑی سے بڑی اور سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو بھی مسکراتے ہوئے کہہ جاتے ہیں پروفیسر آل احمد سرور کہتے ہیں کہ

" اکبر نہ صرف مردِ مومن تھے بلکہ مومن گر بھی تھے "[2]

ان کے یہاں لئے دیئے رہنے کا انداز تو بالکل نہ تھا رکھ رکھاؤ اگرچہ اس دور کا خاصہ تھا لیکن اکبر اس انداز کو ناپسند کرتے تھے یہ الگ بات ہے کہ قوم نے اکبر کے صحیح مقام کو نہ سمجھا اور انہیں محض ایک ظریف کہہ کر ٹال دیا۔ بقول ڈاکٹر غلام حسین صاحب یوں کہیئے کہ

" جس چیز کو ان کی ظرافت کہا جاتا ہے وہ ان کے خونِ جگر کی بوندیں ہوتی ہیں "[3]

حقیقت یہ ہے کہ وہ علامہ اقبال کے پیشرو اور تحریک پاکستان کے اولین داعیوں

---

[1] حیات اکبر ص ۱۴۶

[2] بحوالہ نشری تقریر کالج میگزین پروگرام ریڈیو پاکستان لاہور از سید وقار عظیم

[3] مقالہ تحقیق برائے پی ایچ ڈی از ڈاکٹر غلام حسین پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

یں سے تھے، اکبر جو باتیں اپنے انداز میں کہہ گئے تھے اقبال نے وہی باتیں حکیمانہ انداز شاعرانہ حسن اور شاہانہ جلال سے تیس سال بعد کہی ہیں ؎۱

یہ حقیقت سب پر روشن ہے کہ فرنگیوں نے ہندوستان میں اپنے قدم ایک تاجر قوم کی حیثیت سے جمائے تھے مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے ان پر خوب چوٹ کی ہے

مصلحت کوش مری فطرت پاکیزہ نہ تھی
حکم حاکم کو کبھی حکم الٰہی نہ کہا
گر یہی میری خطا ہے تو خطا وار ہوں میں
میں نے شمشیر فروشوں کو سپاہی نہ کہا ؎۲

کچھ عرصہ تک یہ تاجر یہ شمشیر فروش اسلامی سلطنت کی کمزوریوں کو دیکھتے رہے برصغیر کے اندرونی حالات کچھ تسلی بخش نہ تھے مغل شہنشاہی اپنا وقار کھو چکی تھی اگرچہ برائے نام تاج و تخت ابھی باقی تھا تاہم صوبے دار اور علاقہ دار خود مختار ہوا چاہتے تھے فرنگیوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور اپنی حکومت کا آغاز بنگال سے کیا رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی سلطنت کی حدود کو کلکتہ سے دہلی تک وسیع کر دیا اور ہندوستان کے طاقتور ترین حکمران بن بیٹھے اور برعظیم پاک و ہند جسے سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا اسے مٹی کا کھلونا بنا کر رکھ دیا ان عیار اور مکار حاکموں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو، کے کلیئے پر عمل کیا یعنی رعایا کو حاکم کیخلاف بھڑکایا وزیر کو بادشاہ کیخلاف لڑایا اور پورے برصغیر کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔

علما نے اس انگریزی علاقے کو جو کلکتہ سے لے کر دہلی تک پھیلا ہوا تھا دارالحرب

؎۱ حیاتِ اکبر ص ۱۴۱ فٹ نوٹ پروفیسر رشید احمد صدیقی

؎۲ رباعی حضرت جوہر مرحوم منقولہ اخبار ہمدرد

قرار دے دیا اور اس استبداد کیخلاف باقاعدہ تگ و دو شروع کردی "وہابی تحریک" اسی جذبۂ حب وطن کی پیداوار ہے اس تحریک اور اس تحریک کے راہبروں کیخلاف جو منافرت آج بھی لوگوں میں پائی جاتی ہے یہ ایک حد تک انگریزی پراپیگنڈے کا نتیجہ ہے

انگریز پہلے تو یہ سب کچھ ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہے لیکن جلد ہی ان کی اسلام دشمنی کی رگ پھڑک اٹھی اور کفر نے یہ محسوس کرلیا اسے صرف حق ہی سے خطرہ ہوسکتا ہے اس خیال کا اظہار ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ النبرا نے ۱۸۴۳ء میں واشگاف لفظوں میں یوں کیا ہے کہ

"میں اس عقیدے کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کرسکتا کہ مسلمان قوم ہی بنیادی طور پر ہماری مخالف ہے اس لئے ہماری صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کو اپنا طرفدار بنائیں" ؎۱

ایک اور انگریز مسٹر ہنٹر نے ۱۸۷۰ء میں ان خیالات کا اظہار کیا کہ

"مسلمانانِ ہندوستان اب بھی اور اس سے بہت عرصہ پہلے بھی حکومت انگلشیہ کیلئے ہندوستان میں ایک مستقل خطرے کی حیثیت رکھتے ہیں" ؎۲

جونہی انگریزوں کو موقع ملا انہوں نے اپنی سلطنت کی حدود کو وسیع کرلیا مسلمانوں کے حق میں ان کا رویہ کبھی بھی مخلصانہ اور ہمدردانہ نہ رہا وہ ہمیشہ ان کو اپنا دشمن گردانتے رہے اگر تھوڑا بہت سلوک مسلمانوں سے کیا تو وہ بھی خود سلطنت افرنگ کی بقا اور ہندوستان میں اس کے تحفظ کے خیال سے کیا ورنہ انگریزوں کو مسلمانوں کی بہبود و ترقی سے قطعی طور پر کوئی دلچسپی نہ تھی۔

؎۱ سید محمود ہند و مسلم کلچرل اکارڈ صہ ۶۵

؎۲ معین احسن جذبی حالی کا سیاسی شعور صہ ۳۰

قیامِ حکومت افرنگ کیخلاف علماء اور عامۃ المسلمین کا اظہار نفرت دیگر کئی اسباب کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحریک کا مرہونِ منت تھا۔ ان کے بعد ان کے خلفاء نے بھی اسلامی تعلیمات کو عام کیا اور قرآنی تعلیمات کی ترویج و اشاعت کیلئے ہر ممکن کوشش کی قرآن حکیم اور دیگر مذہبی بنیادی کتابوں کے تراجم عمل میں آئے عوام کے ذہن سے شرک و بدعت کا قلع قمع کرنے کیلئے شاہ صاحب کے خلفاء اور شاگردوں نے پوری پوری کوشش کی اسلامی حکومت کے قیام کی باقاعدہ کوشش ہوئی۔ یہ ساری باتیں وہابی تحریک کا طرۂ امتیاز کہی جا سکتی ہیں حضرت سید احمد شہیدؒ کی سرکردگی میں مسلمان سرحد پہنچے انہیں سرحدی مسلمانوں کی حمایت کا مکمل یقین تھا آپ نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے بالاکوٹ میں ایک اسلامی حکومت قائم بھی کر لی مگر یہ حکومت انہی مسلمان سرحدی قبائل کی باہمی چپقلش کی بناء پر ختم ہو گئی، اور آپ بالاکوٹ میں سکھوں کیخلاف جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے بعض لوگوں کے نزدیک سید احمد شہیدؒ کی تحریک صرف مذہبی اصلاح اور اہل شرک و بدعت کے خاتمہ پر موقوف تھی۔ حالانکہ یہ تحریک دراصل سکھوں اور غیر ملکی استعمار کیخلاف تھی۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کے خطوط ان کے اس اعلیٰ و ارفع مقصد کی ترجمانی صحیح طور سے کرتے ہیں ذیل میں درج کردہ ایک ہی اقتباس کافی لائقِ اعتماد سند ہے۔

" ہمارا جھگڑا امراء اور رؤسائے اسلام سے نہیں بلکہ ہم کو لانبے بالوں والوں اور دیگر فتنہ انگیز کافروں سے جنگ کرنا ہے نہ کہ اپنے کلمہ گو بھائیوں سے ــ" لے

سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی یہ جاندار اور قابل قدر تحریک اگرچہ بعض وجوہ کی بنا پر ظاہری طور پر ختم ہو گئی مگر جو چنگاری اس تحریک نے

لے سیرت سید احمد شہید مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صہ ۱۱۰

سینوں میں سلگائی وہ برسوں سینوں کو گرماتی رہی اور بالآخر تحریک پاکستان کی روح رواں بنی ایکیلے سید احمد خان مرحوم کی تحریک شائد روحِ آزادی کو نہ گرما سکتی اور ایک آزاد اسلامی حکومت کی راہ نہ دکھا سکتی۔ شمالی ہندوستان میں اسے وہابی تحریک اور بنگال میں فرائضی تحریک کا نام دے کر بدنام کرنے کی کوشش کی گئی دراصل یہ دونوں تحریکیں مقصد وعمل کے اعتبار سے ایک ہی تھیں دونوں کے پیش نظر ایک سے مقاصد تھے اس پوری تحریک کا واحد مقصد ایک اسلامی سلطنت کا قیام تھا اس کی کوششوں اور سرگرمیوں کے بارے میں ڈاکٹر ہنٹر رقم طراز ہے کہ

"بنگال کے ایک پولیس افسر کی رپورٹ یہ تھی کہ ان کے صرف ایک واعظ نے اسی ہزار مرید جمع کر رکھے ہیں جو آپس میں پورا پورا بھائی چارہ رکھتے ہیں اور ایک مقصد کو ساری جماعت کا مقصد سمجھتے ہیں بعد کے خلفاء بالخصوص یحییٰ علی نے جنوبی بنگال کے "فرائضیوں" اور شمالی ہندوستان کے "وہابیوں" کو آپس میں مدغم کر دیا تھا" [1]

یہ دونوں تحریکیں اصلاً ایک ہی تھیں اور انگریزوں کے لئے دردِ سر بنی رہیں۔ ان تحریکوں کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی تحریک آزادی پر روشنی پڑ سکے اور ہم یہ دیکھ سکیں کہ وہ کون سے حالات تھے جنہوں نے ہماری قوم کو اور قوم کے مختلف اکابر کو متاثر کیا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے مغلیہ خاندان کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو محروم تاج و تخت کر دیا اور اس کے اہل وعیال پر اس کی آنکھوں کے سامنے مشق ستم روا رکھی مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے ان پر اچھی ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان، ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر (ترجمہ ڈاکٹر صادق حسین) ص ۱۵۲

مسلمانوں کے دلوں میں اس سے مختلف قسم کے شکوک پیدا ہونے لگے موقعہ شناس ہندوؤں نے اس صورت حال سے بڑا فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کیخلاف انگریزوں کے کان بھرنے شروع کر دیئے مسلمان اپنی جگہ پر انگریزوں سے اور زیادہ نفرت کرنے لگے اس نفرت کا نتیجہ دو طرح سے ظاہر ہوا ـــــ اولاً یہ کہ انگریزوں سے مفاہمت کی کوئی فوری صورت نظر نہیں آئی تو وہ گوشہ نشین ہونے لگے اسلامی تصوف کے پردے میں عجمی رہبانیت نے اپنا اثر دکھایا اور مسلمان عملی دنیا سے کنارہ کش ہو کر خانقاہی طرز زندگی اختیار کرنے لگے۔ جن لوگوں کو اس ناروا تبدیلی کا احساس تھا وہ بھی عملی طور پر اس کا کچھ حل نہ تلاش کر سکتے تھے چنانچہ ناامیدی اور یاس کے اس دور میں انہیں کوئی روشنی نظر نہ آئی تھی مسلمانوں کی دل برداشتگی کا یہ عالم تھا کہ وہ عام زندگی کی دوڑ میں بھی اپنے ہموطنوں یعنی ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے اس کمی کو ہر مکتب فکر کے لوگوں نے محسوس کیا اس خلاء کو پُر کرنے انگیریزوں اور مسلمانوں میں مفاہمت سی پیدا کرنے کا بیڑہ سر سید احمد خان مرحوم نے اٹھایا مگر نتیجہ زیادہ خوش کن نہ برآمد ہوا۔ حق یہ ہے کہ اس سے ہماری ـــ قومی انفرادیت ہمارا شعور ملی اور اسلامی دنظریاتی طرز فکر مجروح ہوئے ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس کا بڑا منصفانہ تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ان کو صرف ایک ہی روشنی نظر آئی لوگ سر سید کی طرف دوڑ پڑے۔ سر سید کی نیک نیتی میں شبہ نہیں ان کی تجویز معقول تھی لیکن سر سید نے تجویز کی حدود کا پورا پورا خیال نہیں رکھا انہوں نے مسلمانوں کے لئے جو نسخہ تجویز کیا اس میں مریض کے مزاج کی رعایت نہیں کی مریض کو اتنی سرد دوائیں دیں اور اتنی بڑی مقدار میں کہ اسے سرسام کا اندیشہ پیدا ہو گیا" [۱]

---

[۱] نئی پرانی قدریں ڈاکٹر شوکت سبزواری صہ ۱۳۳

سطور ذیل میں برّصغیر کی اس دوسری بڑی تحریک کا جائزہ لیا جاتا ہے آج سرسیّد احمد خان کو تحریک پاکستان کا اوّلین داعی دو قومی نظریّے کا بانی اور محسن ملّت اسلامیہ کہا جاتا ہے مگر یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں بعض لوگ آج بھی انہیں انگریزی سامراج کا پروردہ انگریزی تہذیب سے جنون کی حد تک متاثر اور انگریز کے ہر اشارے پر چلنے والے ایک ریفارمر قرار دیتے ہیں وہ انہیں مغرب زدہ گروہ کے محبوب ترین راہ نما سے زیادہ کوئی مقام نہیں دیتے بقول محترمہ مریم جمیلہ بیگم سر سیّد ایک (خود ساختہ ثالث بالخیر تھے)

"self styled Mediator" تھے [1] لیکن یہ نقطۂ نظر بھی انتہا کی نذر ہو گیا۔

سر سیّد احمد خان ماہر تعلیم اور قومی مصلح تھے یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے تاہم اس حقیقت سے تو کسی باشعور فرد کو انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ نظام تعلیم جو برّصغیر کے باشندوں کو فرنگیوں کی بدولت حاصل ہوا وہ اس نظام تعلیم سے حد درجہ مختلف ہے جو اس وقت خود برطانیہ میں رائج تھا۔ خواجہ غلام السیّدین اپنی کتاب اقبال کے فلسفۂ تعلیم میں اس حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں کہ ہم اس نظام تعلیم کو بجا طور پر ضیائے بے نور کہہ سکتے ہیں [2] حکمران اور پھر انگریز سے غاصب حکمران ہرگز یہ نہ چاہتے تھے کہ وہ اس نظام تعلیم کو جو ان کے ملک برطانیہ میں رائج تھا اُسے اسی حیثیت سے برصغیر پاک و ہند میں رائج کر دیں مبادا کہ محکوم اس سے بہرہ ور سکیں

---

[1] اسلام اینڈ ماڈرن ازم از مریم جمیلہ بیگم پبلشر محمد یوسف خان کرشن نگر لاہور

[2] اقبالز ایجوکیشنل فلاسفی از کے جی سیّدین

وہ تو ہمیں ایک ایسا نظام تعلیم دینا چاہتے تھے جو ہماری سوچ تہذیب ثقافت اور فکر کو بدل کر رکھ دے اور اس نظام نے اپنا پورا اثر دکھایا ہندوستان کے نئے پڑھے لکھے افراد بھی اپنے کو انگریزوں کے ہمنوا اور ان ہی کا نمائندہ سمجھنے لگے اس نظام نے کلرکوں کی ایک فوج پیدا کردی جو انگریز کے دفتری کاروبار کو چلانے کے لئے پوری طرح سود مند ثابت ہوئی اس نظام تعلیم پر رجنی پام دت نے بڑی منصفانہ رائے دی ہے وہ کہتے ہیں کہ

"اس تعلیم کی غائت یہ تھی کہ سامراجی نظم و نسق زیادہ سے زیادہ خوش اسلوبی سے چل سکے ـــــ"[۱]

سر سید احمد خان اس تعلیمی پروگرام کے داعی اور اسے متعارف کرانے والے تھے وہ اپنے جوش خلوص اور شوق تجدید میں دور تک نہ دیکھ سکے نئی تعلیمات اور ایجادات سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہ یورپ کے سفر کے بعد ہندوستان کے باشندوں کو حیوان اور جانور کہنے لگے[۲] یہ صرف اسی ماحول کی برکت تھی نئی تعلیم کی بدولت پوری قوم کا مزاج بدل گیا اور ہم اپنی انفرادیت کھو بیٹھے زبان ہی کے مسئلے کو لیجئے انگریزی نظام تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے نظام تعلیم کو کھویا ہی تھا مگر اپنی زبان کو بھی کھو بیٹھے برصغیر کے باشندے حاکموں کی زبان بولنے میں فخر محسوس کرتے تھے اس طرح وہ اپنی زبان سے بے بہرہ ہو کر اپنے اسلاف کے کارناموں سے بھی محروم ہو گئے آباد اجداد کے علمی سرمائے سے ہاتھ دھو بیٹھے انگریزوں کے اسلاف کی تاریخ نے ان کے کارہائے

---

[۱] نیا ہندوستان از رجنی پام دت صہ ۵۵۴

[۲] خطوط سر سید صہ ۴۱

نمایاں نے، ان کی جگہ لی اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ پوری قوم احساس کمتری کا شکار ہو کر انگریزوں کی دست بستہ غلام بن گئی جب کبھی ان کے شعور نے کروٹ لی تو نام نہاد ترقی کر کے ظاہری نمود اور حکمران کی ساحری نے پھر اسے گہری نیند سلا دیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے مسلم قوم کو تہ و بالا کر کے رکھدیا تھا لہٰذا سر سید ہر طرح سے چوکنا رہنا اور اپنی قوم کو جوکنا رکھنا چاہتے تھے وہ مزید تباہی کی گنجائش نہ دیکھتے تھے اسی خیال کے تحت ہر طریقے کو اپنانے اور اختیار کرنے پر آمادہ رہتے تھے ان کا خیال غلط سہی مگر بصد خلوص انہوں نے اس وقت مسلمانوں کی بقا اس میں دیکھی کہ وہ امن میں رہیں اور اپنی حالت سنوار کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں وہ ابنائے وقت کی غداری اور خود غرضی سے پوری طرح آگاہ تھے چنانچہ بہ تقاضائے وقت انہیں کم از کم یہی محسوس ہوا کہ وہ مسلمانوں کی خیر خواہی کے لئے انگریزی حکومت کا استحکام چاہیں۔ آج ہمیں بدلے ہوئے حالات میں شائد یہ روش شکست خوردگی کی پیداوار نظر آئے۔

سر سید کو حکومت کے استحکام کا اس قدر خیال تھا کہ وہ معمولی قسم کے سیاسی ہنگامے کو بھی برداشت نہ کر پاتے تھے انہوں نے صرف کانگریس کے ہندوؤں کی ہی مخالفت نہیں کی بلکہ جنگ بلقان کے دوران جب ہندوستانی مسلمان ترکی اور خلیفہ ترکی کی حمایت میں انگریزوں سے بدظن ہو رہے تھے تو انہوں نے ترکوں کے مقابلے میں انگریزوں ہی کی طرف داری کی اور خلیفہ ترکی کو روحانی پیشوا ماننے سے انکار کر دیا۔" [1]

مذہبی امور میں بھی سر سید نے بھی کئی اجتہادی غلطیاں کی ہیں اور ان غلطیوں کی بدولت انہوں نے پوری قوم کو روحانی اقدار اور مذہبی تقاضوں سے ہٹا کر پیٹ پوجا اور فراہمی روزگار

---

[1] تہذیب اخلاق صہ ۳۷۴

کی پٹڑی پر لگادیا اور اپنے اس اجتہاد کو بہ بانگ دہل بلند کیا اس سے پورا برصغیر چونک اٹھا
سر سیّد نے مذہب کی آڑ لے کر برصغیر کے مسلمانوں کو ان کے مذہب سے بے بہرہ کر دیا اور ان
میں مذہب کے بارے میں عجیب بے تعلقی کا جذبہ پیدا ہوگیا سر سید نے مسلمانوں کو ایک مغربی طرز
کی قوم بناکر اسے اسلام سے نزدیک لانے کی کوشش کی ۔ اس میں سر سید احمد خان حق بجانب
تھے کیونکہ اسلام اور معاشی نظام کا ساتھ چولی دامن کا ہے یہ الگ بات کہ انتہا پسندی میں
لوگوں نے سر سیّد کے مسلک سے بھی جائز فائدہ نہ اٹھایا۔ سر سید کہتے ہیں کہ

"پیٹ ایسی چیز ہے کہ دین رہے یا جاوے خدا ملے یا نہ ملے اسکو بھرنا چاہیئے" [۱]

سید کی تحریر سے صرف یکطرفہ مطلب نکال لینا بھی تو انصاف کا تقاضہ نہیں اس مسئلے
پر ان کی تمام آراء کو مدنظر رکھنا توازن کے لئے ضروری ہے سید احمد خان مرحوم اپنے دین و دنیا
کے بارے میں اس مسلک کی مزید توضیح یوں فرماتے ہیں

"دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی البتہ دنیا چھوڑنے سے دین جاتا رہتا ہے" [۲]

اور اس انداز میں ہم ان کے خیالات کو حدیث سے ثابت کر سکتے ہیں رسولؐ کا فرمان
ہے کہ " کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا " [۳] قریب ہے کہ گدائی (محتاجی)
کفر بن جائے —"

سر سید کے ایسے تصورات اپنی عملی شکل میں بجائے افادے کے ایک حد تک قوم کی ذہنی
پریشانی کا موجب بن رہے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم نے مذہب کے دامن کو چھوڑا اور قوم

---

۱ تہذیب اخلاق صہ ۱۵۲

۲ لیکچرز سیّد احمد خان صہ ۵۰

۳ جواہر البخاری مطبع الاستقامۃ بالقاہرہ طبعۃ سادسہ ۱۳۵۷ ھجری

نے مادی انداز سے سوچنا شروع کردیا۔ مذہب کی ان کے نزدیک زیادہ اہمیت نہ رہی مذہب امت مسلم کا محور تھا اب اس کی ضرورت اور اس کا احساس مٹنے لگا سرسید کی تعلیمات نے بعض ایسے نتائج پیدا کئے جو بعض اہل دل کو سخت ناپسند تھے ان ہی میں سے اکبر بھی تھے وہ بھی متاثر ہوئے اور کہہ اٹھے کہ

افسوس ہے گلشن کو خزاں لوٹ رہی ہے
شاخِ گل تر سوکھ کے اب ٹوٹ رہی ہے
اس قوم سے وہ عادتِ دیرینۂ طاعت
بالکل نہیں چھوٹی ہے مگر چھوٹ رہی ہے
وہ راہِ شریعت کہ جہاں بچتی تھی آنکھیں
یہ کفر کے لنگر سے اسے کوٹ رہی ہے ۱؎

تحریکِ آزادی وطن کی تگ و دو میں بھی سرسید احمد خان کا کردار بڑا دلچسپ ہے وہ اس سے الگ تھلگ رہے نہ انہوں نے خود عملی سیاسیات میں حصہ لیا اور نہ ہی قوم کے لئے کبھی کوئی لائحہ تجویز کیا نہ ہی وہ نظری طور پر اس تحریک اور جدوجہد مسلسل کے حامی تھے ان کی تحریروں میں کہیں بھی آزادی پسند تحریکوں کی حمایت کا عنصر نمایاں نہیں ہے انہوں نے محبِ وطن علماء کے فتاویٰ کو جعلی قرار دیا جو انہوں نے تحریکِ آزادی کو "جہاد" سے تعبیر کر کر دیئے تھے کیونکہ علماء کے نزدیک جنگِ آزادی کا فرض اور عیسائیوں کے غلبہ سے نجات حاصل کرنا تھی سرسید احمد خان کے اس رویہ کیخلاف حضرت مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی مرحوم کا م
یہ بیان کافی ہے جو انہوں نے انگریز سے ظالم اور جابر حکمران کی عدالتِ تحقیق کے سامنے دیا تھا

۱؎ اکبر الٰہ آبادی از طالب الٰہ آبادی صہ ۱۴۴

• وہ فتویٰ صحیح ہے اور میرا لکھا ہوا ہے اور آج بھی میری وہی رائے ہے " ۱

سید نے صرف اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے سید نے ایک رسالہ بموسوم " لائل محمڈنز آف انڈیا " رقم کیا اس میں ان مسلمانوں کے کارنامے تھے جو جنگ آزادی کے وقت انگریزوں کے حلیف ساتھی اور وفادار تھے۔

یہ انگریزوں کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں یہ سارا ڈرامہ کھیلنے کے لئے ایک باوقار اور پرامن اسٹیج اور چاک و چوبند کردار میسر آئے تھے جو اپنے ڈائرکٹر کے ہر تقاضے کے مطابق اپنے کو بہ طریق احسن ڈھالنے کو تیار تھے بعض لوگوں نے سرسید کی پالیسی کو کبھی تو اس مجبوری کا تابع بتایا۔ کہ وہ اپنے تعلیمی منصوبے کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے اور کبھی اس تحریک کا یہ اثر دکھلایا کہ انگریزوں کے رویہ میں کچھ تبدیلی اور مسلمانوں کیلئے رواداری محض سرسید کی تحریک کی رہین منت ہے حالانکہ یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ بہت کم وزن رکھتی ہیں جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انگریزوں کی مسلمانوں کے بارے میں پالیسی میں تبدیلی ہوئی یہ محض سطحیت پر مبنی ہے انگریز شروع سے کر آخر تک مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتے رہے اور ظاہری طور پر جو کچھ رواداری انہوں نے دکھائی وہ خود انگریزی اقتدار اور تسلط کی بقا کیلئے تھی اگر انگریز ایسا قدم نہ اٹھاتے تو اس سے انگریزی استعمار کو ہی نقصان تھا اسی لئے بنیادی طور پر ان کی یہ رواداری کسی تحریک یا دباؤ کی مرہون منت ہرگز نہ تھی اور نہ ہی انگریز نے سرسید تحریک سے متاثر ہو کر مسلمانوں کے حق میں کچھ شفقت برتی۔

یہ حیرت کہ خود سرسید احمد خان مرحوم جو انگریزوں کی فکر اور تہذیب سے بہت متاثر تھے اور انہیں مغرب کی ہر بات میں حقیقت نظر آتی تھی وہ بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ

• کانگریس کے مطالبات کچھ ٹھیک ہی تھے ___ ۲

---

۱ المشورۃ الہندیہ صہ ۱۴۰ ۲ ایمی نینٹ مسلمانز صہ ۳۵ (EMINENT MUSALMANS)

ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے وہ کہتے ہیں کہ سر سید نے بنگالیوں کے ایجی ٹیشن کو بھی جزوی ایجی ٹیشن قرار دیا جب علیگڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر بیک نے کانگریس کے توڑ میں یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک سوسائٹی بنائی اور یہ ناکام رہی اور دوبارہ کانگریس کا زور کم کرنے کے لئے سر سید نے ۱۸۹۳ء میں محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کی بنا ڈالی لیکن سر سید احمد خان کا ذاتی نقطہ نظر اس میں شامل تھا اور وہ کسی حد تک اپنے حالات کے پیش نظر حق بجانب تھے کیونکہ ۱۸۹۳ء میں کانگریس کی حیثیت ہی کیا تھی سر سید ہندوؤں کے ساتھ تعاون سے گھبراتے تھے ہندو تو جہاں جب چاہتے گنگا جمنا میں نہا کر پوتر ہو جاتے اور مسلمان سادہ لوح تھے مکر کی چالوں سے آگاہ نہ تھے وہ شاید پھر نقصان اٹھاتے غالباً سر سید اسی لئے سیاسی معاملات سے علیحدگی اور توقف کے قائل تھے اسی لئے سر سید نے کچھ عرصہ پہلے امیر علی کی نیشنل کانگریس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ فرق صرف انیس بیس ہی کا تھا سر سید ہر اس کام کو کرنے کے لئے تیار تھے جو ان کے لائق احترام آقا انگریز کے نزدیک مستحسن تھا یہ اس لئے تھا کہ اس کے سوا سید کے نزدیک کوئی دوسرا چناؤ یا متبادل طریقہ نہ تھا چنانچہ تاریخی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ شعوری طور پر مسلمانوں کو انگریزوں کی وفادار رعایا بنانے کی کوشش کرتے رہے، کہتے ہیں کہ

"ہندوستان میں ہم نے اپنی بھلائی کے لئے انگلش حکومت قائم کی ہے "[1]

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ

"انگریزوں کی امان سے علیحدہ ہونا اور غنیم کو مدد دینا کسی حالت میں بھی مسلمان کا فرض نہیں ہے"[2]

---

[1] حیات جاوید جلد دوم صہ ۲۳

[2] ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر سر سید احمد خان کی نکتہ چینی صہ ۸۷

اپنے لیکچروں کے مجموعہ میں یوں گویا ہیں کہ

"انگلش گورنمنٹ کا بہت دنوں تک بلکہ ہمیشہ کیلئے رہنا ہمارے لئے ضروری ہے" [1]

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ انہوں نے کیوں کیا؟ کیا انہوں نے انگریزوں سے کوئی جاگیر پائی یا شخصی فائدہ اٹھایا تاریخ شاہد ہے کہ غدر میں جب ایک انگریز کی جان بچانے پر سرسید کو ایک جاگیر دی گئی تو سید نے وہ بھی لینے سے انکار کر دیا ہمیں سرسید کی نیت پر بالکل شبہ نہیں ان میں خلوص اپنی اعلےٰ سطح پر موجود تھا مگر طریق کار میں اور تہذیب فرنگ کی ظاہری چمک دمک کی بناء پر وہ اس کی تہ تک نہ پہنچ سکے اور اس سے ہمیں نقصان بھی ہوا۔

سرسید کا تعلیمی پروگرام جسے وہ مسلمانوں کی ترقی سے تعبیر کرتے تھے انگریزوں ہی کا متعارف کرایا ہوا تھا اور یہ غلامی کے درس سے لبریز تھا سرسید انگریزوں کے ان مضامین اور خیالات کو جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوتے تھے انہیں اپنا تسلیم کرتے تھے حالانکہ گزٹ کے کالموں میں مسٹر بیک پرنسپل علیگڑھ کالج کے مضامین شائع ہوتے تھے جن کو نہ صرف عام طور پر سرسید احمد خان کا سمجھ لیا جاتا تھا بلکہ سید خود بھی انہیں اپنا ماننے سے انکار نہ کرتے تھے انگریز کے ہنر و دانش کا اندازہ کیجئے کہ اس نے کس طرح ہمارے خلوص مند راہنماؤں کے خلوص کا استحصال (EXPLOIT) کیا۔ میر ولایت حسین صاحب کی رائے مذکورہ بالا دعویٰ کی پوری پوری تائید کرتی ہے۔

"بیک نے بنگالیوں اور ان کی تحریک کیخلاف انسٹیٹیوٹ گزٹ کے ایڈیٹوریل کالم میں مضامین لکھنا شروع کئے جو سرسید سے منسوب ہوئے اور بنگالیوں نے سرسید کو برا بھلا کہنا شروع کیا اس طرح بنگالیوں سے اعلانیہ لڑائی شروع ہو گئی۔" [2]

---

[1] لیکچرز از سرسید احمد خان صہ ۲۵۹ [2] مسلمانوں کا روشن مستقبل از میر ولایت حسین صہ ۲۸۰

"سرسید خود یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کی تحریک میں توازن نہیں ان کو یہ خیال پریشان کرنے لگا تھا کہ اگر اس میں توازن نہ رکھا گیا تو ان کی تحریک آگے چل کر بڑی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے ۔۔۔۔" [1]

سرسید تحریک کے ایک مشہور و معروف رکن اور ہمارے قومی شاعر مولانا حالی مرحوم نے بھی سرسید کی اس ذہنی کیفیت کے بارے میں اظہار کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

"سنہ ۱۸۸۴ء میں انہیں یہ شکایت پیدا ہوگئی تھی کہ انگریزوں کو مسلمانوں سے وہ ہمدردی نہیں جس کے وہ (یعنی سرسید) متمنی تھے ۔۔۔۔" [2]

بعض لوگ اس سے یہ تاثر لے سکتے ہیں کہ سید کو انگریزوں کا مفاد زیادہ عزیز تھا۔ تو یہ بات صریحاً غلط ہے پھر انہیں اس بات کا احساس نہ ہوتا کہ ان کی تحریک غیر متوازن ہوا چاہتی ہے یا انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ متوقع سلوک نہیں کیا؟ یہ ان کے خلوص کی علامت ہے کہ انہیں اپنی قوم کے احساس نے چونکا دیا اور وہ پریشان رہنے لگے۔ مگر اب اس پریشانی کا علاج سید کے ہاں سوائے صبر کے کچھ اور نہ تھا اسی لئے تو اکبر بھی سید کے خلوص کے قائل تھے اور کہتے ہیں کہ

؎ ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا ۔۔۔ [3]

یہ محض ان کے خلوص کے حضور نذرانہ تھا حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کا اصلی روپ آج بھی ہمارے سامنے نہیں آتا اور ہمارے بعض اہل قلم غلطی کو غلطی ماننے سے کیوں

---

۱ نئی پرانی قدریں ۔۔۔ اکبر و سرسید ص ۱۳۴

۲ حیات جاوید جلد دوم ص ۴۱ ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا

۳ سید کی وفات پر اکبر کا یہ کہنا کہ ؎ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

گھبراتے ہیں روائتی طور پر دورِ غلامی کا یہ تصوّر کہ سرسید ہی ملت اسلامیہ کی کشتی کے ناخدا تھے آج بھی ورثے میں چلا آتا ہے حالانکہ تھوڑے سے غور و فکر کی ضرورت ہے اکبر کے بارے میں کچھ غلط تاثرات بلاشبہ نئی تعلیم کے پیدا کردہ ہیں جس کا تعارف فرنگیوں نے برصغیر میں کرایا

اکبر مرحوم نے انتہائی خلوص سے مسلمانوں کو سیدھی راہ دکھائی اور اس تحریک سے جو زیادہ تر غلامانہ ذہنیتوں کو جنم دینے والی تھی پوری طرح خبردار کیا اور قوم کو زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی مغرب اور تقلیدِ مغرب سے روکا کہ ہمارے دکھوں کا علاج تقلیدِ مغرب نہیں بلکہ اپنے مخصوص نظریہ حیات پر عمل کرنے اور قومی روایات کو دوبارہ زندہ کرنے میں مضمر ہے —— ہمارے جدید ناقدین نے اکثر اوقات اکبر سے ناانصافی کی ہے ان کے اس رویہ کے بارے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب کا یہ کہنا ہے کہ

" اکبر کو ہمارے نئے نقّادوں نے سمجھا نہیں کسی نے انہیں معمولی قسم کا انسان بتایا کسی نے قدامت پرست اور رجعت پسند ٹھہرایا کسی کو ان کے ہاں ابتذال اور عامیانہ پن نظر آیا کسی کو دل لگی اور چٹکلے بازی اکبر کی عظمت ان کی فکر کی عظمت میں ہے ان کے نکتہ نگاہ کی بلندی میں ہے ان کے اس مشن میں ہے جس نے اقبال کو جنم دیا اکبر نہ ہوتے تو شاید اقبال بھی نہ ہوتے ——" [1]

---

[1] نئی پرانی قدریں ڈاکٹر شوکت سبزواری صـ ۱۳۶

باب دوم

سیاسی شعور کا ارتقاء

اکبر ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء کو الٰہ آباد کے ایک نزدیکی گاؤں بارہ بنکی میں پیدا ہوئے آپ کا خاندان اسلامی علوم و فنون کا گہوارہ تھا آپ کے والد ماجد مولوی سیّد تفضل حسین مشرقی علوم کے دلدادہ تھے اور ان میں گہری نظر رکھتے تھے تاہم وہ مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم سے بھی استفادہ کے حامی تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اکبر کو خود ایک انگریزی اسکول میں داخل کرایا[1] اگرچہ اکبر اپنی اس تعلیم کو مکمل نہ کر سکے لیکن اس سے اُن کے والد ماجد کی فراخ نظری کا ثبوت ضرور ملتا ہے اکبر کے گھر والے کوئی رئیس یا جاگیردار نہ تھے لیکن یہ گھرانہ درمیانے درجے کا کھاتا پیتا گھر ضرور تھا اکبر نے اس گھر میں آنکھ کھولی اور اپنی آئندہ زندگی کو سنوارنے کے لئے اسی طرح محنت و مشقت کی جس طرح متوسط گھرانے کے ایک فرد کو کرنا پڑتی ہے انہوں نے ایک معمولی سے درجے کی ملازمت سے ابتدا کی۔ سیشن جج ہوئے۔ ہائیکورٹ کی ججی پیش کی گئی جسے خود انہوں نے قبول نہ کیا۔ محنت مستقل مزاجی دلیری ذہانت اور ذکاوت اکبر کی فطرت کے نمایاں عناصر تھے وہ کبھی بھی حالات سے گھبرائے نہیں حالات کا مقابلہ انہوں نے بڑی جوانمردی کے ساتھ

---

[1] اس انگریزی اسکول کا نام جمنا بائی اسکول تھا۔ ص ۳۱۴ اے ہسٹری آف اردو لٹریچر بابائی ڈاکٹر صادق

کیا۔ خود فرماتے ہیں کہ

لوگ کہتے ہیں بدلتا ہے زمانہ سب کو
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

اور یہ حقیقت ہے کہ اکبر نے اپنے زمانے کو اپنی ڈگر پر چلانے کی کوشش کی اور کبھی ہار نہ مانی یہ ہار نہ ماننے کا جذبہ بچپن ہی سے اکبر کی طبیعت میں موجود تھا اکبر ابھی نئے نویلے نوجوان ہی تھے کہ انہیں فکر روزگار نے سرگرداں پھرایا ایک دفعہ ایک دفتر میں چند آسامیاں خالی ہوئیں دوسرے شائقین روزگار کے ساتھ اکبر نے بھی درخواست دے دی دیر تک ان درخواستوں کے نتیجے کا انتظار ہوتا رہا مگر حکام کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا آخر طے یہ پایا کہ اکبر جائیں اور پتہ چلائیں اس واقعہ کو ان کے فرزند ارجمند سید عشرت حسین نے یوں بیان کیا ہے۔

"کسی دوسرے افسر کے یہاں درخواستیں دے کر لوگ احاطے سے باہر انتظار میں بیٹھے تھے دیر لگی تو حضرت قبلہ کا انتخاب ہوا کہ جائیں اور خبر لائیں اس افسر کو یہ بھی ناگوار گزرا اس نے حکم دیا کہ لڑکے پر بلی (BILLY) چھوڑ دو۔ بلی کتے کا نام تھا ایک بہت بڑا کتا حضرت قبلہ کی طرف دوڑا لیکن حضرت قبلہ اب کے اپنی جگہ سے نہیں ہلے جمے کھڑے رہے کتا آیا اور سونگھ سانگھ کر چل دیا" [1]

اس پر افسر آپ کی دلیری سے بڑا متاثر ہوا اور اس نے آپ کو اسامی پر مقرر کر دیا یہ دلیری آپ کو ورثے میں ملی تھی۔ آپ کے دادا مرحوم نے آپ کو ایک تلوار دی اور اس تلوار کے ساتھ ہمت اور جوانمردی کی تلقین فرمائی یہ تلوار آپ کے ننھے منے جسم پر انہوں نے خود اپنے دستِ

1 ص ۶۲ حیاتِ اکبر تسوید و تہذیب عشرت حسین و ملا واحدی

مبارک سے سجائی۔ سید عشرت حسین بیان کرتے ہیں

"حضرت قبلہ کے پاس گذشتہ صدی کے خاتمہ تک ایک تلوار رہی اور دادا صاحب نے جو فرمایا تھا اس کا ایک مرتبہ ظہور ہوا یعنی رگِ ہاشمی جوش میں آگئی اور حضرت قبلہ نے تلوار سونت لی تفصیل کیا بتاؤں ــــــ" ؎۱

خواجہ حسن نظامی دہلوی نے اس پر یوں حاشیہ آرائی کی ہے

"عشرت میاں نے غالباً انگریز حکومت کا لحاظ کر کے تفصیل کو مبہم رکھا تلوار انگریز کیخلاف جہاد تھا اس قسم کا کوئی مرحلہ پیش آیا ہوگا جس میں حضرتِ اکبر نے تلوار کھینچ لی ہوگی۔ کاش عشرت میاں تفصیل بیان کر سکتے" ؎۲

اس جوانمردی اور دلیری کے ساتھ ساتھ محنت کا جذبہ بھی اکبر کی فطرتِ ثانیہ بن گیا تھا انہوں نے نوکری کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیمی استعداد کو بھی بڑھانے کے لئے بھرپور کوشش کی وکالت کا امتحان پاس کرنے کا عزم کیا تو اس کے لئے تگ و دو شروع کی۔ کچھ کتابیں نہ ملتی تھیں دیکھئے اکبر نے مانگے کی کتابوں سے کیسے فائدہ اٹھایا اس امر کے بارے میں سید بشیر حسین صاحب علیگڑھ میگزین کے اکبر نمبر میں یوں رقمطراز ہیں کہ

"اکبر کے ایک چچا سید سراج الدین حیدر صاحب تھے جو نہایت کامیاب وکیل تھے ایک دن اکبر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ تعزیرات ہند (IPC) رات بھر کیلئے عنایت فرمایئے انہوں نے فرمایا خیر تو ہے مشاعروں میں قانون کی کتاب کی کیا ضرورت۔ ؛ عرض کیا وکالت ہائیکورٹ کا امتحان دونگا رات بھر میں تیس چالیس صفحات دیکھ لیا کروں گا چچا صاحب ہنسے اور فرمایا کہ بیٹا قانون

؎۱ ص۵۹ حیات اکبر تسوید سید عشرت حسین تہذیب و ترتیب ملا واحدی

؎۲ فٹ نوٹ ص۵۹ حیاتِ اکبر از خواجہ حسن نظامی دہلوی

کی کتاب کیا ہے لو یہ لے چنے چبانے ہیں خیر کتاب لے جاؤ۔ صبح واپس کرنے گئے انہوں نے پوچھا کیا دیکھا عرض کیا کہ کوئی سوال کیجئے، پچاس صفحے دیکھے ہیں وہ پھر ہنسے سوال مشکل کیا اکبر نے لفظ بہ لفظ کتاب کی عبارت سنادی فرطِ محبت سے کھڑے ہو کر چچا نے بھتیجے کو گلے لگالیا [1]

۱۸۶۳ء سے لے کر پندرہ سال تک اکبر ملازمت کے مختلف مدارج سے منسلک رہے وہ نقل نویس، مسل خوان اور تحصیلدار بھی رہے ہائیکورٹ کی وکالت اور اس کے بعد ۱۸۸۰ء میں قائم مقام منصف رہے پھر سب ججی کے عہدے پر ترقی ہوئی [2] اور آخری عمر میں ہائیکورٹ کی ججی کے لئے بھی کہا گیا اکبر کو حالات نے اجازت نہ دی انگریز کی ملازمت اکبر کو ان کی زندگی کے اصولوں سے منحرف نہ کر سکی اکبر نے کبھی مرعوب ہو کر اپنے اصولوں کی قربانی نہ دی بقول ظفر احمد صدیقی

"اکبر انگریزی حکومت کے ملازم تھے لیکن ان کا دل مغرب کی سیاسی اور ذہنی غلامی سے باغی تھا [3]

نوکری میں بھی اس مردِ حق پرست کا رویہ مجاہدانہ رہا اور ذاتی مفادات کی خاطر انہوں نے قومی مفادات کو کبھی پس پشت نہ ڈالا وہ برابر اپنے مشن کی خاطر کام کرتے چلے گئے۔

"۱۸۹۴ء میں سیشن جج کے لئے حضرت قبلہ کا انتخاب ہوا حضرت قبلہ سے پہلے یہ عہدہ کسی ہندوستانی کو نہ ملا تھا حضرت قبلہ پر ان ترقیوں کا کیا اثر تھا وہ ان کے مندرجہ ذیل شعر سے عیاں ہے جو انہوں نے اسی زمانے میں فرمایا تھا۔

نیٹیو وقعت کے گم ہونے کا ہے اکبر کو غم   آفیشل وقعت کا اس کو کچھ مزا ملتا نہیں " [4]

---

[1] حیات اکبر ص ۷۵ بحوالہ علیگڑھ میگزین اکبر نمبر

[2] ص ۳۰۴ اے ہسٹری آف اردو لٹریچر ڈاکٹر محمد صادق باب پندرھواں " اکبر الٰہ آبادی "

[3] علیگڑھ میگزین اکبر نمبر   [4] حیاتِ اکبر بیان سید عشرت حسین ص ۸۸

بااختیار منصب افسران کا مزاج بدل کر رکھ دیتے ہیں اور وہ اپنے کو عام انسانوں سے بلند تر سمجھنے لگ جاتے ہیں اور اپنی حاکمانہ انفرادیت کی بقا کیلئے ان خصائل سے گریز کرنے لگ جاتے ہیں جو ایک عام آدمی کیلئے شرافت کا نشان ہوتے ہیں حتیٰ کہ عبادات سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی جاتی ہے۔ اس لئے کہ عبادات میں عام سے عام آدمی بھی ان کا شریک ہو سکتا ہے اکبر کے مزاج پر ان عہدوں نے کوئی ایسا رنگ نہ چڑھایا یا یوں کہیئے کہ اکبر نے کبھی اس رنگ کو اپنی طبیعت پر غالب نہ آنے دیا۔

"اکبر ۱۹۰۱ء میں سہارنپور کے سیشن جج تھے دیوبند سہارنپور کے نزدیک ہے دیوبند کے علماء نے سنا کہ سید اکبر حسین سیشن جج کام روک کر نماز ادا کرتے ہیں تو اُن سے ملنے آئے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بھی زندہ تھے انہوں نے بھی تحسین کی اور مبارکباد بھیجی" [1]

کرسی پر بیٹھے ہوئے حق و انصاف کا دامن اکبر کے ہاتھ سے کبھی نہ چھوٹا۔ انگریز بظاہر حق و انصاف کا نعرہ لگاتے تھے مگر بعض مقدمات میں ججوں سے اپنے حسب منشا بھی فیصلے کرایا کرتے تھے ایک دفعہ ایک مقدمے میں انگریز چیف سیکرٹری نے اکبر کو بھی ایسا کرنے کو کہا اکبر کی منصف مزاج اور اصول پرست شخصیت ایسا ہرگز نہ کر سکتی تھی چنانچہ انہوں نے صاف انکار کر دیا کوئی اور ہوتا تو مصلحت وقت اور حکم حاکم کا نعرہ لگا کر صاف بچ نکلتا

"ایک دفعہ فیصلے کے بعد اس مقدمہ کے متعلق حضرت قبلہ اور چیف سیکرٹری میں باتیں ہوئیں حضرت قبلہ نے فرمایا میرے سامنے اگر شیطان بھی کوئی خاص الزام لگا کر پیش کیا جائے تو میں اس خاص الزام کی تحقیقات ضرور کرونگا شیطان کو شیطان جان کر خاص الزام کا مجرم قرار نہیں دوں گا" [2]

---

[1] حیات اکبر صہ ۹۱ تسوید و تہذیب عشرت حسین و ملا واحدی

[2] حیات اکبر صہ ۹۳

اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جو شخص زندگی کے ہر موڑ پر خواہ یہ انگریزی نوکری ہو یا اس کا حکم ہمیشہ حق و انصاف اور اصولوں کا ساتھ صرف اس لئے دیتا ہے کہ جس فلسفۂ حیات کا وہ پیرو ہے وہ اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ بے اصولی کرے وہ قدم رکھتا ہے تو پھونک پھونک کر۔ زندگی سے نتائج مرتب کرتا ہے تو بڑے غور و فکر کے بعد۔ کیا اُسے اس بات کیلئے مورد الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے کہ اس نے علیگڑھ تحریک کی مخالفت محض جذباتیت کی بناء پر کی یا یہ کہ اسے مغرب کی تہذیب سے بے وجہ چڑ تھی بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی

" اکبر کا عقیدہ تھا کہ علیگڑھ کو خوب کی پیروی آنکھ بند کرکے نہ کرنی چاہیئے اور خوب کی برکات میں فائدہ اٹھانے سے خود اپنی میراث کی طرف غفلت برتنا مناسب نہیں بذاتِ خود میں یہ نہیں مانتا کہ اکبر علیگڑھ اور سر سید پر کسی تنگ نظری یا رجعت پسندی کی بناء پر نکتہ چینی کرتے تھے ـــــ " [۱]

جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ بپا ہوا تو اکبر کی عمر کوئی گیارہ برس تھی۔ یہ وہ دور تھا۔ جب اکبر کے کانوں میں بھی انگریز کی سفاکیت کی داستانیں پڑ رہی تھیں یہ داستانیں ان کے تحت الشعور میں بالکل اسی طرح رچی بسی رہیں جس طرح بچپن کی دیگر دلچسپ رنگین حکایات تاہم عمر کے ساتھ جب ان کے شعور نے کروٹ لی تو انہوں نے سنجیدگی سے اس تبدیلی کا جائزہ لیا اور اس کے نتائج درد دل کی صورت میں ان کے اشعار میں ڈھل گئے یہ اس دور اور اس تبدیلی کی پوری ترجمانی کرتے ہیں

خبر دیتی ہے تحریکِ ہوا تبدیل موسم کی
کھلیں گے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہوں گے

---

[۱] بحوالہ علیگڑھ میگزین اکبر نمبر مضمون پروفیسر رشید احمد صدیقی ، حیاتِ اکبر ص ۱۲۱

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
کسی کو اس تغیّر کا نہ حِس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہونگے
تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے ۱؎

اکبر کو اس تبدیلی کا بڑا احساس تھا وہ اس سے دوسروں کو بھی خبردار کرتے ہیں
برصغیر کے لوگوں کو مغرب کے بارے میں نقطۂ نظر یا جو ردعمل پایا جاتا ہے وہ اکبر ریال
ہی کے انتباہ کا مرہونِ منت ہے بقول ڈاکٹر محمد صادق

"Much of the present day attitude of India towards the west can be traced to the warning voice, which Akbar and after him Iqbal raised against the West." ۲؎

اکبر نے اپنے اشعار کے ذریعہ نہ صرف اہلِ قوم و وطن کو اس تبدیلی کا احساس دلایا بلکہ ان کو جھنجھوڑا بھی ہے ساتھ ہی ساتھ مغرب اور مغربیت پر واشگاف لفظوں میں رائے زنی کی ہے اور جو بڑی متوازن اور فکر انگیز ہے ان کی یہ شاعرانہ رائیں انگریز کی مکارانہ اور عیارانہ چالوں کو بے نقاب کرتی ہیں۔

۱؎ کلیاتِ اکبر مطبوعہ بزم اکبر کراچی

۲؎ History of Urdu Literature P 310-311 Dr M. Sadiq

بقیہ فٹ نوٹ

؎ ڈاکٹر محمد صادق صاحب نے اپنی کتاب میں کچھ ایسے مضامین شامل کرئیے ہیں جو انہوں نے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کیلئے قبل از تقسیم کے زمانہ میں لکھے تھے اس لئے انڈیا سے مُراد پاک براعظم ہند تصور کی جائے۔

اس سے ہماری قومی تحریک ہمارے سامنے آجاتی ہے بقول ڈاکٹر غلام حسین صاحب غالباً یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ اردو شاعری میں اکبر پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اپنے فن سے انگریزی شہنشاہیت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ۔ ؎

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا جو اثر ایک عام آدمی پر اور بالخصوص مسلمانوں پر پڑ رہا تھا وہ بھی اکبر کی نظر سے پوشیدہ نہ تھا اس دور کے مسلمانوں کی حالت نہایت قابل رحم تھی وہ ذہنی اور عقلی طور پر بھی کشمکش میں مبتلا تھے۔ حاکم کی حکمت عملی انہیں بری طرح کچل رہی تھی مسلمانوں کی بے بسی اور بے چارگی کا ذکر ڈاکٹر غلام حسین صاحب یوں کرتے ہیں۔ کہ

۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ایک طویل عرصہ تک برطانوی حکومت نے مسلمانوں کو خوفزدہ اور ہراساں کرنے کی خاطر مختلف تدابیر اختیار کیں اس حکمت عملی کے نتیجے میں اُن کی بے کسی اور بے چارگی کی جو حالت ہو گئی تھی اس کے ایک دلچسپ عبرت انگیز پہلو کا مرقع ذیل کے اشعار میں ملاحظہ فرمائیے اُس قطعہ کا نفس مضمون ایک تاریخی حقیقت پر مبنی ہے محض شاعرانہ طبع آزمائی نہیں ۔ ؎

جو پوچھا مجھ سے دورِ نَو نے کیا تو مسلماں ہے
میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا رمز پنہاں ہے

؎ مقالہ تحقیق از ڈاکٹر غلام حسین صاحب برائے پی ایچ ڈی مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ص ۵۔
؎ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کروں اقرار تو شائد یہ بے مہری کرے مجھ سے
اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قہرِ یزداں ہے
بالآخر کہہ دیا میں نے کہ گو مسلم تو ہے بندہ
ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے خانساماں سے ؎۱

ہمارے کچھ نقاد اکبر کی شاعری اور ان کے طریق کار پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے گو طنز اور ظرافت سے کام لیا۔ نئی روشنی اور مغرب کا تمسخر اڑایا قوم کو مغرب اور تقلیدِ مغرب سے روکا مگر تلقین کی تو اُن مشرقی قدروں کو اپنانے کی جن کا چلت اب معاشرے میں نہ تھا اُن کی ان آراء کو ہم اسلئے تسلیم نہیں کر سکتے کہ اکبر نے کبھی بھی مکمل طور پر مشرقی بننے کی تلقین نہیں کی اور نہ مکمل مغربیت چاہتے تھے انہوں نے تلقین کی تو درمیانی راستے کی ـــ جو ہر لحاظ سے مستحسن تھا ـــ بقول ڈاکٹر وزیر آغا صاحب

"اکبر مرحوم کا وہ حصہ کلام بھی قابل توجہ ہے جس میں انہوں نے مغرب کو نشانہ طنز بنانے اور مشرق کو ایک بلند مقام پر دکھلانے کی بجائے دونوں میں توازن پیدا کرنے کا درس دیا ہے ؎۲

اور سچ یہ ہے کہ توازن کا یہی درس ایک راہنما دیتا ہے اس طرح اکبر ہمیں ایک مرثیہ خواں نظر نہیں آتے بلکہ ایک باتدبر اور روشن خیال و روشن دماغ انسان نظر آتے ہیں اور ایک راہ نما کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں

"اکبر اگر پند و نصیحت کی ڈگر اختیار کرتے تو اُن کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دیتا

؎۱ ڈاکٹر غلام حسین مقالہ پی ایچ ڈی

؎۲ مقالہ تحقیق برائے پی ایچ ڈی از ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۱۱۱ بہ موسوم اردو ادب میں طنز و مزاح

اگر وہ محض نکتہ چین ہوتے تو آج سینکڑوں دوسرے نکتہ چینوں کی طرح قعرِ گمنامی میں غرق ہو گئے ہوتے قومی مرثیہ خوانی میں حالی کے سامنے کسی کا چراغ نہ جل سکتا تھا اس حالت میں اکبر نے جو طرزِ سخن اختیار کی وہ بالکل موزوں مناسب اور موقع محل کے عین مطابق تھی " [1]

وہ اپنی اس طرزِ خاص کے بارے میں خود یوں گویا ہیں کہ

غلطی بھی ریا کار کی کھلتی رہے اکبر
طعنوں سے مگر طرزِ مہذب بھی نہ چھوٹے

اکبر نے پہلی مرتبہ ظرافت اور مزاح کو مقصدیت کا تابع بنایا۔ ورنہ پہلے کے اساتذہ کے یہاں فن کی یہ قسم محض تفننِ طبع کا ایک ذریعہ تھی اکبر کو قدامت پرست اور قدامت پسند کہنے والے ذرا یہ تو سوچیں کہ وہ شخص جو موجودہ زمانے کا جدید ترین ہتھیار یعنی ظرافت برائے اصلاح استعمال میں لاتا ہے کیا وہ دانستہ طور پر جذباتیت کا شکار ہونا پسند کرتا ہے۔ زندگی اکبر کیلئے ایک چیلنج تھی ایک عظیم اعلیٰ وارفع مقصد تھی ان کی زندگی کا یہ مطمع نظر انفرادی نہیں اجتماعی تھا۔ بقول رام بابو سکسینہ

Life had a meaning to him

اگر بہ نظرِ غور دیکھا جائے تو یہ اکبر کا ادراک و شعور تھا جس کی بنا پر انہوں نے یہ جدید ترین طریقہ اور اسلوب اپنایا حالانکہ سر سید میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو یورپ کے مشہور مزاح نگار مصلحین ایڈیسن اور اسٹیل کے تتبع کا دم بھرتے تھے اور ان کی ڈگر پر چلنے کا نہ صرف دعوے کرتے تھے بلکہ انہوں نے ٹیٹلر اور سپیکٹیٹر ہی کے نمونے کے طور پر تہذیب

---

[1] مقالہ تحقیقی از ڈاکٹر غلام حسین صہ ۹۲/۹۱م اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر

الاخلاق جاری کیا تھا بقول ڈاکٹر محمد صادق صاحب

Addison and steel were humourists and laughed at the follies of the day." I

اگرچہ تہذیب الاخلاق نے کافی خدمت سرانجام دی مگر پھر بھی نقل اور اصل کے درمیان کا خلا کبھی پُر نہ ہو سکا اکبر نے اپنی سوئی ہوئی قوم کو جگانے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس کے لئے ظرافت کا پیرایہ اپنایا۔ فرماتے ہیں کہ

لغزشیں مدِ ظرافت میں جو کچھ آئیں نظر
دوستوں سے التجا یہ ہے کریں اس کو معاف
سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برف بار
شاہدِ معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

اور یہ لحاف بقول ڈاکٹر آفتاب احمد قریشی

" اکبر کی سب سے بڑی مجبوری یہ ہے کہ ان کے بیشتر ناقد اس لحاف کی فرد، گوٹ اور ابرے کی دلکشی میں کچھ اس درجہ محو ہو کر رہ جاتے ہیں کہ انہیں اس بات تک کا احساس نہ ہو سکا کہ اکبر کی شعری کائنات میں اس سے کہیں زیادہ خوشنما حسین اور دلنواز مناظر ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو محض ہنسنے ہنسانے کے محرک نہیں فکر و غور کے بھی لائق ہیں ___ " ؎۲

اکبر کے اس جدید طریق اصلاح کے بارے میں ڈاکٹر صادق صاحب یوں فرماتے ہیں

؎۱ A HISTORY OF URDU LITT. Page 260

بحوالہ مضمون ترجمان العصر اکبر الہ آبادی از ڈاکٹر آفتاب احمد قریشی شعبہ اردو فارسی ڈھاکہ مطبوعہ سیارہ ماہ اکتوبر ۱۹۶۳ء ص ۴۹

"Medieval in outlook, he is modern in his method, humour is specially a modern weapon to fight folly." I

اکبر کے سیاسی شعور کا ایک زندہ ثبوت ان کا انداز فکر ہے وہ اسی بات پر زیادہ تشویش کا اظہار کرتے ہیں کہ حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ ایک عارضی شے تھی غم تو اس بات کا ہے کہ ہم نے اپنی اساس تہذیبی ورثے اسلامی روایات اور سوچنے کے رجحانات کو کھو دیا ہے اب ہم سیاسی غلامی کے بعد ذہنی غلامی اور مرعوبیت کا شکار ہو کر اپنی ملّی انفرادیت کو کھو رہے ہیں اپنے مرکز سے یہ دوری انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اکبر کے ہاں ان کی ملّی عصبیت زندہ و تابندہ تھی ملّت کا یہ احساس انہیں بے حد عزیز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غلامی کے اس دور میں بھی آزادانہ نکتہ نظر رکھتے تھے۔

"سیاسی اور سماجی مسائل کے بارے میں ان کا زاویہ نظر بڑا حکیمانہ و سائنٹفک" تھا وہ مغرب کے مادّی و علمی عروج اور مشرق کے ذہنی و روحانی زوال کو ایک حقیقت پسند مفکّر کی نظر سے دیکھ کر اس کا تجزیہ کر رہے تھے [۲]

پروفیسر آل احمد سرور

"تفصیلات میں طریق کار کو سمجھنے میں عادت کو پرکھنے اور بہاؤ کا رُخ دیکھنے میں بعض جزئیات میں وہ سر سیّد سے بہتر نظر رکھتے تھے۔ [۳]

---

[۱] اے ہسٹری آف اردو لٹریچر

[۲] اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر از ڈاکٹر غلام حسین ص ۵۰۸

[۳] نئے اور پرانے چراغ سر سید و اکبر از پروفیسر آل احمد سرور ص ۲۴۲

اکبر مغربی تصوّرِ قومیت کے قائل نہ تھے اُن کے یہاں ملّت کا تصوّر ہے وہ قوم کے عناصر ترکیبی سے غیر مطمئن تھے ملّت کی تقویت کیلئے وہ ملّت کے سرمائے کے تحفظ کا نعرہ لگاتے تھے اور اس تہذیبی سرمائے سے بیگانگی کو وہ ملّت کی موت سے تعبیر کرتے تھے یہ سرمایہ اسلامی اقدار اور روایات ہیں اقدار و روایات کو ترک کرنے سے ملّت کا وجود خطرے میں پڑ سکتا ہے ملّت بظاہر تو زندہ رہتی ہے مگر زندگی کی روح اس سے چھن جاتی ہے علیگڑھ تحریک جو اپنے تہذیبی ورثے سے عملی طور پر دور ہو رہی ہے سید اکبر حسین اس کی حیثیت پر یوں رائے زنی کرتے ہیں۔

دیکھ آئے قوم کہتے تھے جسے
چند لڑکے ہیں مشن اسکول کے
ہے یہی ان کی ترقی کا مدار
رہ گئے ہیں گملوں ہی میں پھول کے

—

ظاہر میں اگرچہ راز سربستہ ہے
مضمون لطیف و خوب برجستہ ہے
پودا نہیں پھول کا علیگڑھ کا بیج
گلداں میں مسلمانوں کا گلدستہ ہے [۱]

گملوں میں پھول کے ہی رہ جانا" اور گلدان میں مسلمانوں کا گلدستہ" اکبر کے یہاں بڑے پر مغز استعارے ہیں یعنی جو پودا گملوں میں اگایا جاتا ہے وہ اسی مٹی میں

---

[۱] کلیاتِ اکبر مطبوعہ بزمِ اکبر

مقید ہے اس کی جڑیں مضبوط نہیں وہ تابع ہے اس مالک کا جو جہاں جی چاہے اسے لٹکا دے یا رکھ دے اور پھر گلدان سے تشبیہہ دینا اور بھی کمال ہے کہ بظاہر تو یہ ترقی ہمیں اس طرح مسحور کرتی ہیں جس طرح گلدان ڈرائنگ روم میں بیٹھنے والوں کو راحت بخشتا ہے مگر یہ راحت اور مسرت بہت حد تک عارضی ہوتی ہے یہ چکا چوند جو مغربی تہذیب اور تعالی میں مسلمانوں کو نظر آتی تھی اس کی حیثیت بھی یہی کچھ تھی اکبر خود اسکی مزید وضاحت کرتے ہیں ملاحظہ فرمایئے

یہ جگنو بھی نئی ہی روشنی سے ملتے جلتے ہیں
اندھیرا ہی رہا جنگل میں گو یہ جا بجا چمکے [۱]

"اس بات کا انہیں سخت قلق اور افسوس تھا کہ مشرق روز بروز اس قیمتی سرمائے اور ورثے سے از خود محروم ہوتا چلا جا رہا ہے اور سیاسی محکومی کے بعد خوشی خوشی مغرب کی ذہنی محکومی کے چنگل میں پھنستا جا رہا ہے [۲] ہم سیاسی غلامی کے بعد ذہنی غلامی کے جال میں پھنسے۔ اکبر کا رد عمل ان کے کلام سے ملاحظہ فرمایئے

مرید دہر ہوئے وضع مغربی کر لی
نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کر لی
آگاہ ہوں نئی خوشس اقبالی سے
واقف ہوں بنائے رتبہ عالی سے
شرطیں عزت کی اور ہیں اکبر
کام چلتا نہیں صرف نقالی سے

---

[۱] کلیات اکبر جلد اول حصہ دوم شائع کردہ بزم اکبر کراچی
[۲] اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر ص ۵۰۹ از ڈاکٹر غلام حسین

یہاں اکبر کی رائے بڑی حقیقت پسندانہ ہے اور اُن کے اس شعور کا پتہ دیتی ہے کہ صرف نقالی سے کام نہیں چلتا کام کے جذبہ اور اسکی روح کو دیکھنا چاہیئے۔

واضح ہوا کہ اکبر اِرد گرد کے مسائل پر بڑا غور و خوض کرتے تھے بقول مولانا عبدالماجد دریاآبادی "اکبر پڑھتے کم تھے سوچتے زیادہ تھے دانش آموز اور حکمت آفریں زیادہ تھے اور ان کی ذہانت بے پناہ تھی ——" [1]

اکبر کے ان فکر کی مزید جولانیاں ملاحظہ کیجئے جو ان کے گہرے سیاسی شعور کا پتہ دیتی ہیں

نقلِ مغرب میں جو چھوڑی ایشیا نے اپنی اصل
گھٹ گئی شانِ عرب حسنِ عجم جاتا رہا

نئی نئی لگ رہی ہیں آنچیں یہ قوم بے کس پگھل رہی ہے
نہ مشرقی ہے نہ مغربی ہے عجیب سانچے میں ڈھل رہی ہے

عمل ان سے ہوا رخصت عقیدوں میں خلل آیا
کوئی پوچھے کہ ان کے ہاتھ کیا نعم البدل آیا
بیاں کرتا تھا بربادی کا اک برگِ خزاں دیدہ
رہا میں باغ میں دو دن کہ بس افسوس کل آیا

اہل مغرب جسطرح ہندوستان یعنی برصغیر کے باشندوں کا مزاج بدل رہے تھے اس کا احساس اس طرح شدت سے کسی دوسرے شاعر کو نہ تھا جتنا اکبر کو —— وہ اس کا اظہار یوں فرماتے ہیں۔

---

[1] دیباچہ خطوط مشاہیر ص ۳۵ از مولانا ماجد دریاآبادی ایڈیٹر صدق جدید دریاآباد بارہ بنکی

ہ مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اب دیکھئے کہ طبیعت کو بدل دینے کا نتیجہ جو اکبر نے اخذ کیا کتنا صحیح اور برجستہ ہے کتنا قریبی مطالعہ ہے ایچ ڈاڈویل نے اس سے ملتی جلتی رائے کا اظہار کیا ہے کہ انگریزی زبان کے رائج کرنے سے کس طرح محکوموں کی طبیعت بدل گئی مزاج میں تبدیلی آگئی اور پوری قوم کا اندازِ فکر اور سے اور ہوگیا۔

"ہندوستانی (زبان) جو پہلے سرکاری کاموں میں استعمال ہوتی تھی اب ان کی زبان پر آسانی سے نہ آتی تھی سرکاری دنیا کی اس بڑھتی ہوئی بے تعلقی پر اگر کسی حد تک پردہ پڑا ہوا تھا تو اسکی وجہ محض یہ تھی کہ ہندوستانی باشندوں نے انگریزی زبان اختیار کرلی تھی [1]

اکبر کو اللہ تعالےٰ نے اندرونی روشنی عطا کی تھی اور اس کی بدولت وہ معاملات کو بطریقِ احسن سمجھنے کا شعور رکھتے تھے بعض لوگ اکبر کو دقیانوسی اور پرانی اقدار کا شیدائی کہہ دیتے ہیں ان کی ظرافت نئی اقدار اور لادینی رجحانات کی مخالفت کو ان کی قدامت پسندی پر محمول کرتے ہیں ان کا یہ خیال صریحاً غلط اور بے بنیاد ہے صرف وہی شخص دین و مذہب کی ان نئی تاویلوں پر یقین کرسکتا ہے جسے بنیادی طور پر مذہبی علوم پر دسترس حاصل نہ ہوسکے جس کے ذہن میں ایک کشمکش بپا ہو اور جو حقیقت کو چشم باطن سے نہ دیکھ سکتا ہو اکبر اُن لوگوں میں سے نہ تھے ان کے نظریات کبھی متزلزل نہ ہوئے ڈاکٹر محمد صادق صاحب اس بات کی تائید میں کہتے ہیں

---

1 Sketch of the History of India.
By H. Dodwell.

Unlike Sayed Ahmad, Shibli and Hali he never passed through a spiritual crisis [۱]

جس نظریہ حیات کے بارے میں وہ بالکل واضح تھے اور اسکی عملی حیثیت ان کے نزدیک کسی طور بھی مشکوک نہ تھی اگر وہ اس پر کاربند تھے تو اس بنا پر انہیں قدامت پسند کہہ دینا بالکل غلط ہے اور یہ حقیقت بھی روز روشن کی طرح واضح ہے کہ وہ نئی چیزوں کے محض اسلئے مخالف نہ تھے کہ وہ نئی ہیں وہ مخالفت اس چیز کے اثرات اور اسکے نتائج کی روشنی میں کیا کرتے تھے یہاں صرف یہی مثال دینا کافی ہے کہ اکبر کے عہد میں تعلیم نسواں کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کیا جا رہا تھا۔ اکبر نے محض جدید ہونے کی بنا پر اسکی مخالفت نہ کی بلکہ انہوں نے اس کی اہمیت کو تسلیم کیا اس نظام تعلیم پر تفصیلی بحث تو آئندہ ابواب میں کی جائے گی۔ بہر طور سید اکبر حسین کا انداز فکر ان اشعار سے ضرور عیاں ہوتا ہے۔

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے
تعلیم خوب ہو تو نہ آئے گی دام میں
خالی یہ تو لگائے گی وہ اپنے کام میں
تعلیم ہے حساب کی بھی واجبات سے
دیوار پر نشان تو ہیں واہیات سے
گھر کا حساب سیکھ لے خود آپ جوڑنا
اچھا نہیں ہے غیر پہ یہ کام چھوڑنا

ا اے ہسٹری آف اردو لٹریچر ص ۲۰۶ Page

اس نظم کے آخر میں حضرت اکبر قوم سے یوں خطاب کرتے ہیں

مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے
حد سے جو بڑھ گیا ہے تو ہے اس کا عمل خراب
آج اس کا خوشنما ہے مگر ہوگا کل خراب

حقیقت یہ ہے کہ اکبر ہمیں ہمیشہ متوازن رہنے کا سبق دیتے ہیں نہ وہ اندھا دھند مخالفت کرتے ہیں اور نہ ہی نام نہاد سوشل ریفارمروں کی طرح موافقت کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔

انگریز نے اپنی تہذیب کا جو ظاہری روپ اور پرتو دکھایا تھا عوام نے نہ صرف اسے بہتر جانا بلکہ ہمارے باشعور راہنماؤں نے بھی اس کو اکسیر سمجھا اور ریلھڑے کر اس کی ترویج اشاعت کے پیچھے پڑ گئے انہوں نے اس کا پوری طرح جائزہ نہ لیا

بقول ڈاکٹر شوکت سبزواری

" سرسید ایک مصلح تھے وہ یہ بھول گئے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان " کرمک نادان" کی طرح ہیں تقریباً سو سال کی سیاسی پستی نے ان کے قومی شعور کی آنکھوں کو اندھا کر دیا تھا وہ اپنی بصیرت کھو چکے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ مغربی تہذیب معاشرت اور علوم و فنون کی تابناکی کی تاب نہ لا سکیں اور اس پر اس طرح ٹوٹ گریں کہ ان کی کوئی بھی ہستی نہ رہے " لے

سید اکبر حسین اکبر علمی طور پر مغرب کے علمی سرمائے کے خلاف ہرگز نہ تھے مگر وہ بے جا مرعوبیت

لے ڈاکٹر شوکت سبزواری نئی پرانی قدریں بمضمون اکبر و سرسید صہ ۱۳۳

اور تقلیدِ کورانہ کے قائل نہ تھے۔

بقول ڈاکٹر غلام حسین

مغرب کی علمی و مادی ترقیوں کے نہ تو وہ منکر تھے اور نہ مخالف بلکہ دوسروں سے کچھ زیادہ ہی وہ انکی طاقت و حکمت کے قائل تھے ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ ان سے مرعوب ہرگز نہ تھے اسے اکبر کی ہٹ دھرمی کہیے یا ان کے ایمان و ایقان کی مضبوطی [1]

انہوں نے اس بیجا مرعوبیت کے رویہ کیخلاف بڑی مستقل مزاجی سے جہاد کیا مزید یہ کہ انگریزوں نے ان نئے علوم کی آڑ میں ایک غلامانہ تصوّرِ حیات اور طرزِ زندگی کا سبق دینا شروع کر دیا جس کا لازمی نتیجہ اسلامی روایات سے انحراف اور ہمارے شعورِ آزادی کا خاتمہ تھا اکبر کسی صورت میں بھی یہ برداشت نہ کر سکتے تھے وہ کورانہ تقلید کرنے والوں سے اور ان لوگوں سے جن کی نظروں کو تہذیبِ مغرب کی چکاچوند اور جھوٹی ضیاء نے خیرہ کر دیا تھا اسے یوں خطاب کرتے ہیں کہ ۔

چہرۂ یورپ کا میں پروانہ ہوں
اس کی ہر بات کا دیوانہ ہوں
شب میں پیدائش ہوئی ہے مثلِ شمع
جلوۂ خورشید سے بیگانہ ہوں

یہ سچ ہے کہ مغلوں کے دورِ انحطاط میں جن لوگوں نے جنم لیا ان کیلئے تو انگریز کا ظاہری حسنِ انتظام اس کا فریب اسکی عیارانہ اور مکارانہ چالیں کافی دلخواہ تھیں مگر کسی نے ان لوگوں سے ان کا شعور نہیں چھینا تھا کہ وہ اپنے دلچسپ اور قابلِ فخر ماضی کو دیکھ کر اپنے نظریۂ حیات پر غور و فکر کر کے اپنی راہیں متعین کر سکیں ہوا یہ کہ ہم نے اپنے انداز سے سوچنا چھوڑ دیا۔

---

[1] اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر صہ ۵۹ از ڈاکٹر غلام حسین

اور ہر چیز کو حاکم کے نقطۂ نظر سے جانچنا اور پرکھنا شروع کر دیا اس بے راہ روی پر بھی اکبر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی
یورپ کا تیری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

اکبر صرف طنز اور تعریض پر اکتفا نہیں کرتے اور نہ ہی وہ محض رونا روتے ہیں بلکہ وہ ہر فکری بوسیدگی اور ذہنی غلامی کا حل بھی تجویز کرتے ہیں یہی ان کا طرۂ امتیاز ہے مندرجہ بالا رباعی میں بھی اکبر ہم سے یہ سوال کرتے نظر آتے ہیں کہ اے اہل ہندوستان کیا تم اپنے اصل اور نسب کو بھول گئے ہو پھر ایک جگہ یوں نصیحت فرماتے ہیں کہ

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اکبر کوئی خدائی فوجدار نہ تھے نہ ہر اچھی بات کو اپنی مندمیں برا بھلا کہہ دیتے کچھ لوگ شاید یہ سمجھتے ہوں کہ اکبر کے پیش نظر سید تحریک کی مخالفت برائے مخالفت ہی تھی۔

ان کا یہ قیاس صداقت پر مبنی نہیں ـــــ اکبر نے دراصل ہر اس جذبے کی مخالفت کی جو قوم کے حق میں مفید نہ تھا۔

بقول سید عشرت حسین "ان کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان مغربی علوم و فنون سے فائدہ اٹھائیں مگر مغربی علوم و فنون سے نقصان اٹھانے کے سخت مخالف تھے۔" ؎

وہ کٹھ ملاؤں کی بھی خبر لیتے ہیں اور بے راہ رو مسٹر کو بھی نہیں بخشتے وہ قوم کو ان دونوں انتہاؤں کی پیروی سے روکتے ہیں۔ اسطور ذیل میں شیخ صاحب سے یوں مخاطب ہیں

شیخ اپنی رگ کو کیا کریں ریشے کو کیا کریں
مذہب کے جھگڑے چھوڑدیں پیشے کو کیا کریں
فرہاد نے کہا کہ مناسب ہے تجھ کو صبر
کہنے لگا بتلایئے تیشے کو کیا کریں!

اس طرح اکبر نے ان راہ نماؤں کی حیثیت کو بے نقاب کیا ہے جو عوام اور بالخصوص مسلمانوں کے حقوق کے دعویدار بنے پھرتے تھے۔ اور جو اِن حقوق کے حصول کے لئے انگریزی استعمار سے مفاہمت کئے ہوئے تھے اور جن کا کام کونسلوں میں اچھل کود کے علاوہ کچھ اور نہ تھا اکبر ان سے یوں مخاطب ہیں کہ

بے شمع کے پروانے ہیں واللہ یہ اکبر
رقصاں ہی انہیں دیکھ لو بس انجمنوں میں

قومی ترقی کا نعرہ اور ترقی کی تحریک یوں تو بڑی دلچسپ تھی اور ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ وہ نہ صرف خود ترقی کرے بلکہ اس کی پوری قوم بھی اس ترقی سے فائدہ اٹھائے چنانچہ ترقی کے اس نعرے کی تقلید بھی بڑے جوش و خروش سے ہونے لگی کسی نے یہ نہ سوچا کہ اس سے ہمیں کیا فائدے حاصل ہوں گے۔ اور کیا نقصانات اور پھر ایک ایسی ترقی جاگاؤں

؎ قول سید عشرت حسین، حیات اکبر ص ۱۴۸/۱۴۷ مطبوعہ بزم اکبر کراچی

کی دین ہے۔ کیا غلاموں کو شعور اور عقل عطا کر سکتی ہے جس کی بدولت یہ ترقی صحیح معنوں میں ترقی کہلانے کی مستحق ہو جائے۔ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس تھی اس کا اندازہ اکبر نے بخوبی کر لیا تھا اور وہ مسلمانوں کو اس کی حیثیت سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے شعر کو پردہ سخن کیا۔

انجن آیا نکل گیا زن سے
سن لیا نام آگ پانی کا!
علم پورا ہمیں سکھائیں اگر
تب کریں شکر مہربانی کا

اس کو اکبر کا صنعتی شعور بھی کہہ سکتے ہیں ــــ کیونکہ انگریز عوام کی تائید و حمایت حاصل کرنے کے لئے ان ریلوں کا ذکر کرتے جو انہوں نے یہاں چلائیں۔ دیگر کارخانوں اور عام زندگی کی سہولتوں کا ذکر کرکے اپنے کارناموں کی داد چاہتے تھے اور ان کا نعرہ یہ تھا کہ ہم اہل ہندوستان کو ترقی یافتہ بنا رہے ہیں اس انسوں کی قلعی اکبر نے بڑے قرینے سے کھولی ہے

آپ کہتے ہیں کہ محض ریلوں کا چلا دینا کوئی ترقی نہیں ترقی کا شکریہ تو بہت ادا کریں کہ ہمیں ریلیں بنانا سکھایا جائے اور ہمیں علم عطا کیا جائے۔

انگریز کب یہ چاہتے تھے۔ اکبر کی نظر ترقی کے اس نتیجے پر بھی تھی جس کی بدولت ہماری روحانی اور اخلاقی زندگی اور اس کی حسین قدریں بری طرح مجروح ہو رہی تھیں

ہ کہتے ہیں کہ ؎

ترقی مستقل وہ ہے جو روحانی ہو اے اکبر
اڑا جو ذرۂ عنصر تو پھر سوئے زمیں آیا

—

مسجدیں چھوڑ کے میخانوں میں جا بیٹھے ہیں
واہ کیا شوق ترقی ہے مسلمانوں میں

—

علم دیں مفقود ہے گم ہے صراطِ مستقیم
خضرِ راہ بنتا ہے ہر غولِ بیابا ں ان دنوں

—

کھل گیا مصحفِ رخسارِ بتانِ مغرب
ہو گئے شیخ بھی حاضر نئی تفسیر کے ساتھ

یہ اس ترقی کا نقشہ ہے جس کا ظاہری روپ قوم کے سامنے تھا اور اصلیت سے قوم واقف نہ تھی یہ سب باتیں اکبر کے سیاسی دلی شعور کا پتہ دیتی ہیں اکبر کا امتیاز یہ ہے کہ وہ صرف قوم کا مرثیہ نہیں کہتے بلکہ قوم کی بیماریوں کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں ایک طرف انہوں نے مغرب پسندانہ روشِ ترقی کو بے نقاب کیا تو دوسری طرف ترقی کے لئے صحیح خطوط بھی متعین کئے اور قوم سے یوں خطاب کیا۔

"تلوار لے کے اٹھتا ہے ہر طالبِ فروغ
دور فلک میں ہیں یہ اشارے ہلال کے

دورِ فلک کو بھی اکبر نے ذو معنی استعمال کیا ہے اولاً اس سے مراد ظلم و استبداد کا دَور ہے یعنی انگریز کی سفاکیت کی طرف اشارہ ہے اور اس سے سبق حاصل کرنے کو کہا ہے اور دوسری جانب عام زمانے طور پر باندھا ہے۔

اکبر نے قوم کے زوال اور انحطاط کا جو تجزیہ کیا ہے وہ ان کے اشعار کی صورت میں یہاں درج کیا جاتا ہے۔

علوم ان کے زبان ان کی پریس اُن کے لغات اُن کے
ہماری زندگی کے سارے اجزاء یہ ہیں مگر ہات اُن کے

تخت کے قابض وہی دیہیم ان کے ہاتھ میں
ملک ان کا رزق کی تقسیم ان کے ہاتھ میں

ہم کو سائے پر جنوں وہ دھوپ میں مصروف کار
رس پہ ہے اپنی نظر اور سیم ان کے ہاتھ میں

مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم ان کے ہاتھ میں تعلیم ان کے ہاتھ میں

مغرب ایسا ہی رہا اور ہے اگر مشرق یہی
ایکدن دیکھیں گے ہفت اقلیم انکے ہاتھ میں

مٹاتے ہیں جو ہم کو وہ تو اپنا کام کرتے ہیں
مجھے حیرت تو اس پہ ہے جو اس مٹنے پہ مرتے ہیں

یہ شعر اتنے واضح ہیں کہ ان سے ہر قاری از خود نتائج اخذ کر سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اکبر اپنے قاری پر اعتماد کرتے ہیں اور اسکے سامنے حقیقت بیان کر دیتے ہیں اور نتائج کا مرتب کرنا خود اسی پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اکبر کے اشعار وعظ نہیں بنے بلکہ ادب کی اعلیٰ قدروں کے حامل بن گئے ہیں اکبر اپنے اس فن کے ذریعہ کہیں واضح اور بسا اوقات در پردہ اپنا پیغام کہہ جاتے ہیں بقول ڈاکٹر غلام حسین

"اکبر نے کہیں در پردہ اور کہیں واشگاف الفاظ میں مغربی استعمار کے خلاف بھرپور وار کئے ہیں ۔" [۱]

سطور ذیل میں اکبر کی براہ راست سیاسی آراء کا جائزہ لیا جاتا ہے جو انہوں نے اپنے زمانے کے سیاسی واقعات و حوادث پر دی ہیں آپ سنہ ۱۹۱۴ء کے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں کہ

" شعر و شاعری میں اب دل نہیں لگتا زمانہ بہت نازک ہے۔
عارفانہ شاعری بھی آج کل دشوار ہے
بزم دنیا میں یہ زور بدگمانی دیکھئے" [۲]

---

۱ اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر ص ۵۰۵
۲ مکاتیب اکبر بنام عزیز لکھنوی جولائی سنہ ۱۶ء زم

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز کی جانب سے ہر ہر بات پر پہرے بٹھائے جا رہے تھے اکبر ڈرتے ہیں کہ عارفانہ شاعری بھی مشکل ہو گئی ہے اس کو بھی گہرے شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط میں اس عہد کے حالات کے بارے میں اکبر بڑے واشگاف لفظوں میں لکھتے ہیں حالانکہ خطوں کے آئینے میں جو اکبر ہمیں نظر آتا ہے وہ بہت محتاط ہے

"ہندوستان کا پالیٹیکس بہت پیچیدہ مشکل اور خطرناک ہوتا جاتا ہے اردو یونیورسٹی بھی اس میں داخل ہے ہندو کا ہوم رول اور ذوق ہندی بھی اس میں داخل ہے ۔" [۱]

اکبر مولانا ماجد ہی کے نام ایک اور خط میں اپنی سیاسی خدمات کا ذکر بھی کرتے ہیں اور کسی خاص صاحب کی طرف اشارہ ہے جن کو انگریز نے قوت اور شہ دے کر ابھارا ہے یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ اشارہ کس خاص شخص کی جانب ہے کوئی محرم راز ہی بتا سکتا ہے البتہ بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبر پالیٹکس سے علاحدہ نہ رہ سکے جو جی میں آیا کہہ گزرے۔

یہ بڑا عیب مجھ میں ہے اکبر　　　جی میں جو آئے کہہ گزرتا ہوں

اب وہ خط بھی ملاحظہ فرمایئے "ان صاحب کو کچھ قوت دی گئی ہے۔ ابھارے گئے ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر شورش ریفارم میں بے اعتدالی ہوئی اور چند نوخیزوں نے پبلک میں صلح کل اور سوشل آمیزش کا کھو کھلا اور ناپائیدار رنگ دکھایا تو دوسری طرف مذہبی تعصب جو زبردست اور مقدس بڑے میاں کے لقب کا مستحق ہے مذموم کیا جائے اور فرق مختلف میں شدید جنگ شروع ہو گی جس سے روشن ضمیر نوجوان بھی بالآخر نہ بچ سکیں گے میں خود عجیب وقت میں ہوں پبلک نے فرض کر لیا ہے کہ میں بڑا محبّ قوم اور اولُل

---

[۱] رقعات اکبر صفحہ ۵۵ مکتوب بنام مولانا ماجد دریا آبادی

درجہ کار فارم خواہ ہوں حالانکہ میں قوم ہی کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا میں نے لامذہبی اور تبدیل وضع کیخلاف قدم اٹھایا تھا نہ کہ گورنمنٹ کے خلاف " لے

سید اکبر حسین، عزیز لکھنوی کے نام ایک مکتوب میں اپنے اشعار اور ان کے مضمون کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اکبر کی یہ رائے بھی ان کی سیاسی تگ و دو اور سعی پیہم کی ترجمانی کرتی ہے۔

" میری زیادہ تر توجہ الحاد پر رہی ہے جو اس زمانے میں پھیل گیا ہے بہت پولیٹیکل ہیں بہت اخلاقی ہیں اگرچہ اشعار شرح طلب ہیں اس میں عام قواعد کا پابند ہوں اگر ظاہراً کہیں کہیں تجاوز ہے تو وہ دلیل کے ساتھ ہے " ۲ے

اکبر نے ہر حال میں قوم بلکہ بقول ان کے ملت کا خیال رکھا جب اکبر کی آنکھیں خراب ہوئیں تو اپنی بینائی کے جانے کا سوائے اس کے کچھ افسوس نہ تھا کہ وہ ملت کے لئے کچھ اور کر گزرتے۔

" بڑے نازک وقت میں آنکھوں نے جواب دیا کچھ نہیں پڑھ سکتا میں خیال کرتا تھا کہ قوم و مذہب کی افسوسناک حالت پر عمدہ اشعار جو حالی، شبلی اور میں نے کہے ہیں اور نیز بعض دیگر حضرات کے ان کو یکجا کرکے چھپوائیے، یادگار رہے کہ مسلمانوں نے یہ سانوحہ کیا تھا ___" ۳ے

خطوط اکبر کے بارے میں رام بابو سکسینہ کا کہنا ہے کہ

"THEY REVEAL THE REAL MAN" ۴

۱ے اکبر کے شب روز یا روزنامچہ مطبوعہ کراچی ۱۰ر جنوری ۱۹۱۹ء

۲ے مکاتیب اکبر ص ۴۴ ۵ر مئی ۱۹۱۰ء

۳ے رقعات اکبر مکتوب بنام منشی شرف الدین احمد خان ۸ر جولائی ۱۹۰۸ء

4:- Akbar Allahabadi by Talib Allahabadi P 114

علاوہ ازیں اکبر کے عہد کی دو زبردست تحریکیں تحریک ترک مُوالات، تحریک خلافت اور پہلی جنگ عظیم بھی تھیں اکبر نے ان کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کیا اور ان کی حیثیت پر اپنے اشعار کے ذریعہ بے لاگ تبصرہ کیا۔ نجی محفلوں میں ان پر بحث کی سطح قرطاس پر اس کو نقش کیا اور آئندہ نسلوں کیلئے نقوش چھوڑے۔ بقول سید عشرت حسین

"مسلمانوں کو جگانا اور ابھارنا حضرت قبلہ کا مشن تھا ـــــ شاعر کے بھیس میں حضرت قبلہ مصلح اور راہ نما تھے راہ نما نہ ہوتے تو محض ایک شاعر سے علی برادران ڈاکٹر انصاری مسٹر نیڈو اور پنڈت مدن موہن مالوی کو تعلق رکھنے کی کیا ضرورت تھی"[۱]

اب اس حقیقت میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ اکبر کا تعلق سیاسیاتِ وطن سے کافی گہرا تھا اکبر کی شخصیت میں ایک ایسی ہمہ گیریت ہے کہ ہر شخص خواہ وہ کسی بھی ذوق کا مالک ہو آپ کی طرف کھنچتا چلا آتا ہے بقول طالب الہ آبادی

"ان کی شہرت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ وہ ہر دلعزیز ہیں روحانی ذوق رکھنے والوں کے لئے ان کے کلام میں تصوّف، علوئے نفس اور تہذیب باطن کے جواہر موجود ہیں ـــ ادبی مذاق والوں کے لئے خوش فکری، بذلہ سنجی زبان و خیال پر قدرت، صنائع لفظی و معنوی سبھی کچھ ہے مجلسیوں کے لئے معاشرت و تمدن کی پیچیدگیاں سلجھائی گئی ہیں سیاست فلسفہ اور ظرافت پسند طبقہ کیلئے سیاست کے نازک مسائل حل کئے گئے ہیں۔ فلسفہ جسم و روح کی موشگافیاں ہوئی ہیں اور ظرافت کے موتی رولے گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ملک کے زبردست سے زبردست دلوں پر ان کا سکہ بیٹھا ہوا ہے"[۲]

---

[۱] حیاتِ اکبر ص ۱۴۹ [۲] اکبر الہ آبادی از طالب آبادی ص ۷

ڈاکٹر محمد صادق اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں اسی طرح رقمطراز ہیں اور طالب الہ آبادی صاحب کی رائے ان کی رائے سے بالکل ملتی جلتی ہے۔

There were covert hits at Government which pleased all, there were tears for sentimentalists jest and word play for witty, Philosophy for thoughtful, Mysticism for religious, National sentiments for Patriots, in short a Literary banquet to suit all plates. I

اسی طرح " انہیں علمی معاشرتی، مدنی، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی میدان اصلاح و دانش کیلئے ملے اور ان کی زندگی کا حقیقی مشن پورا ہونے لگا " ۲ے

جب تحریک ترک موالات شروع ہوئی تو ملک کے ہر ذی شعور آدمی کو اس پر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی ــــ اکبر کا ردعمل مولوی صبغت اللہ صاحب فرنگی محلی کی زبانی آپ بھی سنیئے۔

" حضرت اکبر نے مزاج پرسی کے بعد پوچھا - کل کیا طے پایا ــــ ب - میں نے اس کی مختصر روداد بیان کی فرمانے لگے کیا نان کو آپریشن کرنا طے ہو جائے گا -؟ میں نے عرض کیا " امید تو یہی ہے ــــ فرمانے لگے یہ انگریزوں کے خلاف یہ اتنا بڑا اقدام کیوں کیا جا رہا ہے ؟ میں نے وہی اخباری جواب دیا - کہ مظالم پنجاب اور

لے اے ہسٹری آف اردو لٹریچر ص ۳۱۵ مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس

لے اکبر الہ آبادی از طالب الہ آبادی ص ۹۸

خلافت کی وجہ سے، فرمانے لگے یہ تو تم نے سیاسی جواب دے دیا یہ بتاؤ کہ حکومت یعنی بادشاہ سے ترکِ موالات اور قطع تعلقات آج سے پہلے بھی کبھی سنا گیا ہے آخر انوکھی چیز کیوں ہو رہی ہے۔ میں نے عرض کیا آپ ہی وجہ بتائیں فرمانے لگے قدرت کی طرف سے انگریزوں کو یہ سزا مل رہی ہے انگریز نے ہر اس شے کو جو مشرق اور ہندوستان کی نگاہ میں محترم تھی۔ نظروں سے گرایا، استاد، مرشد، ماں باپ اور آخر میں رسول اور خدا کی عظمت اور عقیدت اپنی تعلیم کے ذریعہ ختم کرنا چاہی اور اس میں ایک حد تک انگریز کامیاب بھی ہوا ان مستحقانِ ادب میں حکومت بھی تھی آج اس کی تذلیل و توہین کا نمبر آ گیا پھر فرمایا میں نے اس خیال کو قطعہ میں یوں نظم کیا ہے۔

یہ وہ ہنگامہ ہے جس کی ہر طرف تائید ہے
آپ کی تعلیم ہے اور آپ کی تقلید ہے
مستحقانِ ادب کو آپ نے رسوا کیا
آپ کے دعوائے عظمت کی بھی اب تردید ہے ؎۱

ترکِ موالات کو اس ملک گیر تحریک سے متاثر ہوئے بغیر اکبر کیسے رہ سکتے تھے ایک انگریز کمشنر نے پیش بندی کے طور پر اس تحریک کی مخالفت میں شعر کہنے کے لئے کہا۔ بقول سید بشیر حسین صاحب " نان کوآپریشن کے دور میں مسٹر گوتج کمشنر نے لکھ کر بھیجا کہ آپ گورنمنٹ سے پنشن پاتے ہیں نان کوآپریشن کی مخالفت میں شعر کہیے ناگوار ہوا اور فرمایا۔

ع بھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف میں کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے ؎۲

؎۱ بیان مولوی صبغت اللہ صاحب فرنگی محلی بحوالہ علیگڈھ میگزین اکبر نمبر
؎۲ حیات اکبر صد ۱۴۵

اس واقعہ کو طالب الہ آبادی نے اپنی کتاب اکبر الہ آبادی میں یوں درج کیا ہے علاوہ ازیں انہوں نے مندرجہ بالا شعر کو ان کے ایک قطعہ کی صورت میں لکھا ہے ___ حکومت کی طرف سے کچھ زمانہ کیلئے خاموش رہنے کا حکم ہوا تھا۔

عشاق کو بھی مالِ تجارت سمجھ لیا
اس قہر کو ملاحظہ لِللہ کیجئے
بھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف میں
کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے" [1]

یہاں "آہ" کا لفظ قابل غور ہے اکبر اپنی ظرافت کو "آہ" سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ درد و کرب ان کے عہد کی پیداوار ہے بقول طالب الہ آبادی "میرے اکبر کے کلام میں جو درد موجود ہے اس کا غالب حصہ دونوں کے مصائبِ حیات کا نتیجہ ہے۔" [2] پھر حکومت انگریزی کی جانب سے خاموش رہنے کا حکم ملا اس پر فرمایا۔

اک غل مچا کہ اس پہ بھی لیسنس ہے ضرور
منہ کھل چکا تھا ورنہ میرا آہ کے لئے [3]

اس کے بعد بھی اکبر انگریزی کی طرف سے عائد کردہ سنسر شپ کے خلاف اپنے اشعار کے ذریعے جہاد کرتے رہے۔

سانس لینے میں بھی اے اکبر کرو اب احتیاط
موقعۂ فریاد و آہِ بے تامل ہو چکا

---

[1] اکبر الہ آبادی از طالب الہ آبادی ص ۷۰/۷۱ [2] اکبر الہ آبادی از طالب الہ آبادی ص ۶۹
[3] حیات اکبر ص ۱۴۶

ہے حکم کہ حس پالیسیوں کے ہو مطابق
اب کام بدن کو نہ رگوں سے نہ نسوں سے

چھوڑنا ممکن ہے اکبر شوخیٔ گفتار کو
ترکِ حق گوئی ہے اکبر محرمِ اسرار کو

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

حکم اکبر کو ہوا ہے کہ کرو ترکِ سخن
خواجہ حافظ بھی نکالے گئے میخانے سے

انگریز نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا اس نے حضرت اکبر کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ خواجہ حسن نظامی دہلوی اور اکبر کی ملاقات پر بھی سیاسی شبہات کی بناء پر پابندی عائد کردی گئی اس کا ثبوت ہمیں حضرت اکبر کے ایک خط سے ملتا ہے جو انہوں نے سرکشن پرشاد مہاراجہ وزیراعظم ریاست حیدرآباد کے نام لکھا

"اپنا کیا حال لکھوں نہ صحت اچھی نہ دل کو اطمینان، اکثر امور باعث انتشارِ خاطر ہیں۔

یہ مطلع ملاحظہ ہو۔

وہی زندہ ہیں جو قوت سے صرفِ عقل کرتے ہیں
ہماری زندگی کیا، زندگی کی نقل کرتے ہیں

تقریباً تین سال سے خواجہ صاحب سے ملنا نہیں ہوا اگرچہ ایک دوسرے کے مشتاق ہیں۔ "[1]

اس خط کے آخری جملے کی تشریح اسی مجموعۂ مکاتیب میں خواجہ حسن نظامی دہلوی یوں کرتے ہیں کہ " اس خط کے اخیر میں تین سال سے میری ملاقات نہ ہونے کا ذکر ہے اور یہ خط ۲۸ دسمبر ۱۸ء کا ہے اس سے ظاہر ہوا کہ انگریزی حکومت محض شبہات کی بناء پر غیر سیاسی تعلقات رکھنے والوں پر پابندیاں عائد کرتی تھی۔"

سید اکبر حسین خود ان پابندیوں کا ذکر اپنے اشعار میں بھی کرتے ہیں۔

ہے منع ملاقات مری ہم نفسوں سے
فریاد کا موقع نہیں فریاد رسوں سے

اکبر نے جنگِ عظیم اول کے بارے میں بھی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے ان کی ایک نظم کا ایک شعر درج کیا جاتا ہے اس سے آپ کی حب الوطنی عیاں ہے۔

" سنہ ۱۹۱۴ء میں یورپ کی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو حضرت قبلہ نے ایک نظم لکھی جس کا پہلا شعر ہے۔

سنا یورپ میں ہر قاصد پیام جنگ لایا ہے
بحمد اللہ اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہے

اس نظم کے لکھتے وقت سلطنتِ برطانیہ شریکِ جنگ نہیں ہوئی تھی مگر نظم کے

---

[1] خطوطِ اکبر بنام مہاراجہ سرکشن پرشاد مطبوعہ دہلی برائے بزم اکبر پاکستان

چھپتے چھپتے شریک جنگ ہو گئی۔ میں جون پور میں تعینات تھا۔ کلکٹر جونپور نے مجھ سے کہا۔

"آپ کے والد کو ایسی نظمیں نہیں لکھنی چاہئیں۔ میں نے بتلایا کہ نظم برطانیہ کی شرکت سے قبل کی ہے"۔ ؎۱

خونِ شہیداں کا احساس اس عہد میں بھی اکبر کو تھا جبکہ عام لوگ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو غدر کہتے تھے ــــــ لائل محمڈنز آف انڈیا میں ان مسلمانوں کے کارنامے بیان کئے گئے جنہوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا ایسے میں اکبر کے سوچنے کا انداز نہ صرف مختلف تھا بلکہ آزادانہ خلوص مندانہ اور دردمندانہ بھی تھا۔ خونِ شہیداں ــــــ! کا احساس اکبر کے سیاسی شعور کا پتہ دیتا ہے ذرا غور کیجئے تو کلام اکبر قوم کے حق میں کتنا مفید تھا ــــــ یا بقول اکبر یہ کہیئے کہ۔

اکبر کا نغمہ قوم کے حق میں مفید ہے
دل کو تو گرم رکھتا ہے گو بے سُرا سہی ؎۲

آپ نے برصغیر کی بڑی اہم سیاسی شخصیت گاندھی جی پر ایک طویل نظم گاندھی نامہ لکھی ہے۔ کلیات کے چوتھے حصے میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں۔

انقلاب آیا نئی دنیا نیا ہنگامہ ہے
شاہ نامہ ہو چکا اب وقت گاندھی نامہ ہے

؎۱ نٹ نوٹ خطوط اکبر ۲۸ دسمبر ۱۸ء
؎۲ اکبر الہ آبادی از طالب الہ آبادی ص ۶۲

سن لو یہ بھید ملک جو گاندھی کے ساتھ ہے
تم کیا ہو صرف پیٹ ہو وہ کیا ہے ہاتھ ہے
نام میں گاندھی کے یہ دلچسپ صنعت ہے نہاں
آن بھی اسمیں گائے بھی اس میں دہی بھی گھی بھی ہے

—

باایں ہمہ بہت ہے تاثیرِ عزمِ گاندھی
طوفاں اٹھا ہوا ہے اور چل رہی ہے آندھی

—

بجھی جاتی ہے شمعِ مشرقی مغرب کی آندھی سے
امید روشنی قائم ہے لیکن بھائی گاندھی سے

—

ادھر تائید باری ہے ادھر تعلیم گاندھی ہے
درِ مقصود کو کھولے خدا ہمت تو باندھی ہے

اکبر نے جو گاندھی جی کی تعریف کی ہے اس کا مقصد یہ تھا کہ شاید سعیٔ باہم کی بدولت ہم انگریز کو مجبور کر سکیں کہ وہ ملک چھوڑ دے اور اس طرح برِصغیر مغرب کے طوفانِ بدتمیزی سے بچ جائے گا۔ بقول پروفیسر آلِ احمد سرور

"گاندھی کی تحریک اکبر سمجھ نہیں سکے تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس تحریک کے سائے میں رجعت پرستی کو بھی فروغ ہوگا۔ اور ہندوستان کی قدیم تہذیب کو بھی نافذ کیا جائے گا۔" [۱]

---

[۱] اکبر کا المیہ از پروفیسر آلِ احمد سرور مطبوعہ رسالہ نگار

بدولت وہ تحریکِ ترک موالات کی طرف کھنچتے چلے آئے۔

جے کی بھی صدا آئے گی جس رخ بھی چلیں گے
لیکن یہ سمجھ لیجئے صاحب نہ ٹلیں گے

یہ پولیٹیکل جرمن یہ ہنگامہ ہے بیسود
اس سے کوئی چیز اپنی جگہ سے نہ ہلے گی!

صاحب سے لڑ بھی جانا اکثر بگڑ بھی جانا
ہے عمدہ اک تماشا یہ امتحاں ہمارا

ہند میں بہرِ تیاں خوب ہے جنجال ان کا
بھیس گاندھی کو چھپا لیتا ہے اقبال ان کا

کیا طلب جو سواراج بھائی گاندھی نے
مچی یہ دھوم کہ ایسے خیال کی کیا بات
کمال پیار سے انگریز نے کہا اِن سے
ہمیں تمہارے ہیں تو پھر ملک و مال کی کیا بات

اگرچہ اکبر وقتی طور پر گاندھی جی کی تحریک کو نہ سمجھ سکے مگر جلد ہی وہ اسکی تہہ تک پہنچ گئے اور انہوں نے گاندھی جی کے ڈھول کا پول کھولا۔

چھوڑ کر بھوسی کرے بکری جو اصلاحِ غذا
گرگ کے پنجے سے جب بھی ہو نہیں سکتی رہا
ان طریقوں سے امیدِ خیر کیا
رہ کے دریا میں مگر سے بیر کیا

نہیں ہرگز مناسب پیش بینی دَورِ گاندھی میں
جو چلتا ہے وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے آندھی میں

کتنی وقیع رائے دی ہے اکبر نے جو سراسر جذباتیت سے بھرپور ایک طوفانی دور تھا اشعار ملاحظہ کیجئے۔

بھائی گاندھی خودسری کی آرزو کے ساتھ ہیں
اور صاحب لوگ عزبِی رنگ و بو کے ساتھ ہیں
مالوی جی سب سے بہتر ہیں مری دانست میں
یعنی مسندریس ہیں اور اپنی گئو کے ساتھ ہیں

یہ جماعت دیکھیے یہ ڈھول تماشا دیکھیے
دو ڈنا یاروں کا ایسا بے تحاشہ دیکھیے

اس میں مسلمانوں کے اس بھول پن اور سادگی کی طرف اشارہ ہے جس کی

ہوں مبارک حضور گاندھی کو!
ایسے دشمن نصیب ہوں کس کو

کرپٹیں خوب اور سر نہ اٹھائیں
اور کھسک جائیں جب کہو کھسکو

سوئے جیل ٹولی مری بڑھ رہی ہے
گورنمنٹ پر ہتھیا چڑھ رہی ہے [1]

اکبر نے قوم کے لئے جو کچھ مناسب جانا اسی کی تائید و حمایت کی انہوں نے جب دیکھا کہ ملک کے لئے تحریک گاندھی کی حمایت بہتر ہے تو ایسا کیا مگر نزدیکی مطالعہ نے جب ہندوانہ ذہنیت کا اصل روپ اکبر پر آشکار کیا تو انہوں نے بڑی بیباکی کے ساتھ اس حقیقت کی نقاب کشائی کی ۔۔۔۔ یہی اکبر کے شعور کا زندہ ثبوت ہے کہ انہوں نے ہندوؤں کی مکارانہ چالوں کو نہ صرف بھانپ لیا بلکہ قوم کو اس سے خبردار بھی کیا ۔۔۔۔ اس کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد پر بھی اکبر نے قلم اٹھائی غرضیکہ برصغیر کے ہر واقعے اور ہنگامے پر اکبر نے اپنی رائے کا اظہار کیا اکبر صحیح طور پر قوم کا درد رکھتے تھے اور قومی مسائل کو سمجھنے کی بصیرت بھی یہ سچ ہے کہ اکبر کی جوانی کی ساری شوخیاں اور رنگینیاں ایک اصلاحی جذبے کے تابع ہو کر رہ گئیں ان کی ظرافت لفظوں کا ہیر پھیر نہ تھی بلکہ ضمیر کی آواز اور صدائے بازگشت تھی جس نے مسکرا کر دلوں پر وہ ضرب لگائی جو "قوم کا رونا رونے والے" بھی نہ لگا سکتے اکبر اپنے گرد و پیش کے حالات سے بڑی حد تک باخبر تھے وہ چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی بڑی فلسفیانہ نظر سے دیکھتے تھے اسکے اسباب و نتائج پر غور کرتے اور پھر اپنی رائے

---

[1] انتخاب اشعار از گاندھی نامہ مطبوعہ الہ آباد

قائم کرتے۔ بڑی غور و خوص کے بعد کسی نتیجے پر پہنچتے اور وہ جس بات کو حق جانتے بہ بانگِ دہل کہتے سرسید تحریک اور کئی دیگر مفاہمت آمیز تحریکوں کی نقاب کشائی جس دلیری کے ساتھ اکبر نے کی ہے۔ یہ کسی دوسرے کے بس کا روگ نہ تھا ۔۔۔

بقول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

"مسلمان جس اندھے پن اور احمقانہ طریقے پر انگریزی تہذیب کی نقل کر رہے تھے۔ اس میں ایک مضحکہ خیز حقیقت مضمر تھی اور اکبر کا کام اس دور کے سچے شاعر کی حیثیت سے یہ تھا کہ اس حماقت کو واضح کرے اور اس پر ہنسے ہنسائے۔" [1]

اکبر نے اس پورے دور اور اس دور میں انگریزوں کی مسلمانوں پر رحم دلی اور ان کے ساتھ بظاہر اچھے برتاؤ کے بارے میں کتنی حقیقت پسندانہ رائے دی ہے

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پر شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی ہے

انگریز نے عوام کے لئے کھانے پینے کا وافر انتظام کیا انہیں خوراک کی تمام ممکن سہولتیں پہنچائیں۔ عوام کی ظاہری صحت و صفائی کا ڈھونگ رچایا۔ مگر ان سے روحانی اور باطنی صحت چھین لی۔

اکبر کے معاصرین کا یہ دعوٰے تھا کہ وہ قوم کی ڈگمگاتی ہوئی نیا کو تھامے ہوئے ہیں اور آزاد قوم کی روح آزادی برصغیر کی مغلوب قوم کے سوئے ہوئے اجسام میں پھونکنا چاہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ساری کوششیں قوم کی بے راہ روی کے لئے ایک خوبصورت جواز تھیں۔

---

[1] مضمون ڈاکٹر محمد احسن فاروقی مطبوعہ علیگڑھ میگزین اکبر نمبر

"سیاسی اعتبار سے کالج (علیگڑھ کالج) کا مقصد مسلمانوں کو تاج برطانیہ کی کارآمد اور وفادار رعایا بنانا تھا ـــــ اس لئے کالج کے قواعد میں یورپین اسٹاف کو کالج کا ایک لازمی عنصر قرار دیا گیا۔ تاکہ مسلمانوں و انگریزوں میں اتحاد و یکجہتی پیدا ہو اور حکومت کو بھی کالج کی خیر خواہی پر اعتماد ہو ـــــ" [2]

---

[2] اے اسکیچ آف دی ہسٹری آف انڈیا از سید محمود ص ۱۹۵

باب سوم

تعلیمی نظریات

ڈاکٹر مہتا ڈی لٹ کا یہ قول ہے کہ

"Literature should remain Literature, it should not be subservient to religion, law, and politics of the Land." I

اپنی جگہ یہ رائے خاصی وزنی ہے ادب اور زندگی کی بحث خاصی پرانی ہے ادب برائے زندگی یا ادب برائے ادب کے نظریات سے ہمیں بحث نہیں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ فنکار جیسے بھی حالات سے دوچار ہوتا ہے وہ اسی دنیا میں رہتا ہے اور حالات خود بخود اسکی فکر کی تمام راہیں متعین کرتے ہیں بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی

" بات یہ ہے کہ ادب انسانوں کے درمیان رہ کر پیش کیا جاتا ہے اس لئے ان میں ان کے ذاتی مسائل کو موضوع بنائے بغیر چارہ نہیں دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس میں زندگی کی اقدار کا جلوہ گر ہونا ضروری ہے ـــــ " ۲

I :- Iqbal the Poet and his message. by Dr. Sinnah

2 :- Page 22 the Development of Urdu criticism by. Dr. Ibadat.

نتیجتہً بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ زندگی اور زندگی کے مسائل ادب کا ایک اہم موضوع ہیں مشرق ہو یا مغرب فنکار ان تعلقات سے اپنا دامن بچا نہیں سکتا ادب میں سماجی اور معاشرتی جھلکیاں ضرور دکھائی دیتی ہیں اکبر اپنے زمانے کے حالات سے بے خبر نہ رہے اُن انہوں نے ہر گام پر فنکارانہ راہنمائی کے فرائض سرانجام دیئے ہیں بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

" اکبر کی شاعری میں قدم قدم پر ہمیں واقعات و رجحانات کے تحلیل تجزیے کی جو کیفیت ملتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جذبہ اور احساس کے ساتھ ساتھ فہم و شعور کو بھی کام میں لاتے ہیں اس لئے ان کی شاعری میں جذباتیت کم اور تفکر زیادہ ہے " [1]

سطور ذیل میں ہمیں اکبر کے تعلیمی نظریات پہ بحث کرنا ہے لیکن اکبر کے ساتھ یہ حادثہ رہا ہے کہ بہت کم لوگوں نے ان کے فکر پر سنجیدگی سے غور کیا ہے۔ ان کے مداحین بھی یہی طرز اپناتے ہیں اور مخالفین بھی۔

یہ الگ بات کہ اکبر نے اپنی شاعری میں موضوعات معین کرکے بحث نہیں کی بلکہ مذہب، فلسفہ، سیاست اور تعلیم کے موضوعات ان کے کلام کے مختلف حصوں میں چراغ تہِ داماں کی طرح نمودار ہو جاتے ہیں بارہا یہ روشنی مدھم پڑ جاتی ہے اور ظرافت کی شوخیاں نمایاں ہو جاتی ہیں لیکن اکثر مقامات پہ ظرافت ان کی سلجھی ہوئی مقصدیت اور فکر کے تابع رہتی ہے با الفاظ دیگر یوں کہیئے کہ اکبر نے مختلف النوع ہیرے جواہرات اور بیش قیمت موتی اپنے معاشرے کی ظلمتوں اور ماحول کی تاریک

---

[1] اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر

وادیوں میں اس طرح بکھرے ہیں کہ ان کو ڈھونڈ نکالنا تلاش کرنے والے کے شعور پر منحصر ہے ان ہی اندھیاروں کی گہرائیوں میں یہ موتی روشنی اور نور کا پیغام بھی دیتے ہیں۔ اکبر کے نظریات ان کے اشعار میں بکھرے پڑے ہیں ان کو باآسانی چنا جا سکتا ہے۔ ضرورت صرف ایک تار کی ہے جس میں انہیں سلیقے سے پرو لیا جائے اگر ایسا ہو سکے تو یہ مالا ہمارے لئے سرمایہ افتخار بن سکتی ہے۔

اکبر کے نظریہ تعلیم کا جائزہ مندرجہ ذیل چند نکات کی روشنی میں لیا جاتا ہے

ا :۔ جدید تعلیم کی مذہب سے بیگانگی (ب) نسلِ نو کی حیثیت (ج) تعلیم نو اور ہمارا تہذیبی و تاریخی ورثہ (د) حقیقی تعلیم کا مقصد خود آگاہی اور خود شناسی۔ (ر) تعلیم نو کا بنیادی مقصد فکرِ معاش :۔ (س) شخصی اثر سے بیگانہ طریقۂ تعلیم (ش) اس کے نتائج اور تعلیم نسواں :۔

اکبر کا نظریہ تعلیم ان نکات پر استوار ہوتا ہے یا یہ کہیئے کہ یہ نکات ایک محور کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور اکبر کا فلسفہ اس کے گرد گھومتا ہے سید نے گھٹاٹوپ اندھیروں میں ایک مشعل جلائی اور لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے اس کی حیثیت پر ڈاکٹر شوکت سبزواری کی رائے ملاحظہ ہو

" پروانہ روشنی پر عاشق ہے مگر اس میں اتنا شعور نہیں کہ وہ طواف شمع پر قناعت کرے اور اسی کے نور اور روشنی سے اپنی ہستی کو جگمگائے۔ وہ شمع پہ ٹوٹ کر گرتا ہے اور جل کر خاکستر ہو جاتا ہے ــــــ تقریباً سو سال کی سیاسی پستی نے ان کی قومی شعور کی آنکھوں کو اندھا کر دیا تھا ــــــ " [۱]

---

[۱] تہذیبی قدریں ــــــ ڈاکٹر شوکت سبزواری ص ۱۳۳

اکبر ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ قوم تقلید کورانہ کرتی چلی جائے انہوں نے قوم کو باقاعدہ ایک پیغام دیا اور اس میں اکبر کہاں تک کامیاب ہوئے اس کے جواب میں ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے نقل کی جاتی ہے۔

" انہوں نے آنے والے طوفان کا مقابلہ بڑی دلیری اور گرم جوشی سے کیا اس طرح اس کی تخریبی قوت گم ہوگئی اور وہ بجائے دونوں کناروں کو دبانے کے ایک خاص رفتار سے بہنے لگا " [۱]

جدید تعلیم اور مذہب

" جدید تعلیم کی بنیادیں میکالے رپورٹ پر استوار کی گئی تھیں " [۲]

یہ تعلیم یورپ میں رائج تعلیم سے بہت مختلف تھی اس میں یورپی جدید تعلیم کی سی چمک تو موجود تھی مگر وہ تجلّی غائب تھی جو قوموں کو شعور کا نور عطا کرتی ہے مذہب اور اسلام کا عقیدہ مسلمانوں کیلئے سب سے بڑی تعلیم تھا ہماری درسگاہیں مذہبی نوعیت کی تھیں اور ان میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم کو بھی ایک مقام حاصل تھا۔ اس نئی تعلیم میں صرف دنیاوی علوم کو بنیادی حیثیت دی گئی مذہبی تعلیم کا عنصر اگر کہیں دکھائی بھی دیتا ہے تو اس کی روح اس سے چھین لی گئی تھی یہ مذہبی تعلیم دوسرے علوم کے تقابل سے بے معنی سی ہوکر رہ گئی تھی اور اپنی جگہ پر دوہرا کام کر رہی تھی ایک طرف تو مسلمانوں سے یہ کہا جاتا تھا کہ نئی تعلیم میں بھی مذہبی تعلیم

---

[۱] اردو شاعری میں طنز و مزاح ڈاکٹر وزیر آغا ص ۲۴۳

[۲] History of Education in india

شامل ہے اور دوسری طرف سے مذہبی تعلیم جس طریقہ سے دی جاتی ہے وہ خود مسلمانوں کے لئے ایک ایسے زہر کا کام کر رہی تھی کہ مسلمان خود مذہب اور اسلام کو ہیچ سمجھنے لگ گئے تھے اور مذہب سے بیگانگی کا باعث یہی تعلیم تھی۔ اکبر کو اس دو عملی سے اختلاف تھا۔ جس کا اظہار انہوں نے برملا کیا مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ

؎ نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یوں ہی کہ گویا آبِ زمزم مے میں داخل ہے

اب آپ ہی غور فرمایئے کہ کسی پیاری تشبیہ سے اکبر نے کام لیا ہے ہر خاص و عام کی رسائی مطالب تک بخوبی ہو سکتی ہے۔ لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی ہے تو شعور کی آنکھ اشکوں کے ہار پرونے پر مجبور ہو جاتی ہے اس بے راہ روی کی طرف اکبر نے ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی بار واشگاف لفظوں میں اظہار خیال کیا ہے۔

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگِ باطن میں مگر باپ سا بیٹا نہ ہوا

وہ راہ شریعت کی جہاں بچھتی تھیں آنکھیں
یہ کفر کے کنکرے اسے کوٹ رہی ہے

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر
گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

اسلام، روحانی اور شخصی اصلاح و ترقی دونوں کا سبق دیتا ہے مگر نئی تعلیم سے روحانیت کا عنصر خارج ہوگیا اس پر اکبر نے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ اکبر خانقاہی روحانیت کے قائل نہ تھے بلکہ ان کے ہاں روحانیت عمل اور تگ و دو کا دوسرا نام تھا۔ اور نئی تعلیم میں یہ باتیں مفقود تھیں اس لئے اکبر نے ان کے خلاف آواز اٹھائی کیونکہ خانقاہیت کی بدولت ہماری قوت عمل سلب ہو رہی تھی

تعلیم جدید سے ہوا کیا حاصل
ہاں کفر کے ساتھ جنگجوئی نہ رہی

نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ اسلام سے منحرف ہونے لگا۔ اس نئے طبقے کے ایک نمائندے مولانا عبدالماجد دریا آبادی ہیں آپ اور آپ کے کئی ہمنوا علیگڑھ کی تعلیم جدید کے نتیجے میں دہریئے ہوگئے تھے اسلام بلکہ خدا کی ذات سے بھی انحراف کرنے لگے۔ ان کی اصلاح اگرچہ مولانا جوہر شوکت اور اکبر نے کی مگر اس دور کے حالات اس بات کے گواہ ہیں کہ ایک بڑا طبقہ اسلام سے منحرف ہوگیا تھا قیامت اور جزا و سزا کا تصور بھی ختم ہوچلا تھا اکبر نے اس بے راہ روی کا مقابلہ کیا اور تعلیم کے ان ہولناک نتائج کا تجزیہ بھی قوم کے سامنے پیش کیا

پڑھے اس جا جہاں تاثیر ملت جا نہیں سکتی
بسے اس جا کہ آواز اذاں بھی آ نہیں سکتی
تمہیں کو ناز ہو لے نوجوانو اس طریقے پر
مری امید تو نغمہ خوشی کا گا نہیں سکتی

ظاہر ہے کہ اس نظام تعلیم سے کچھ ترقی نہ ہو سکتی تھی۔ اور اگر کسی ترقی

کی امید تھی بھی تو اسی صورت میں کہ اس کا رشتہ ہماری فکری اساس کے ساتھ مربوط رہتا

مجھے اس درس سے خواہش تھی روحانی ترقی کی
یہاں ہر چیز لیکن مادّی و عنصری نکلی [1]

نہ روح مذہب نہ قلب عارف نہ شاعرانہ زبان باقی
زمین ہماری بدل گئی ہے اگرچہ ہے آسمان باقی

دین کی الفت دلوں سے ان کے یوں ہی گر مٹی
مسلم اٹھ جائیں گے رہ جائے گی یونیورسٹی

اس تجزیئے کے ساتھ ساتھ اکبر قوم کو دعوت عمل بھی دیتے ہیں اور متوازن راہ اختیار کرنے کی پُر زور تلقین کرتے ہیں ان کی یہ تلقین اگرچہ تجزیاتی تنقید — (Analitical criticism —) کی ذیل میں آتی ہے لیکن درس عملی بھی دیتی ہے

الحاد کی بنیاد ہے جس چیز نے ڈالی
دشمن اسے سمجھے گی نظر دیکھنے والی
اکبر کی فغاں کو نہ کہو خام خیالی
فرماتے ہیں رو رو کے یہ خود حضرت حالی

---

[1] کلیات اکبر صہ ۵۴

اے خاصہ خاصان رُسل وقت دُعا ہے
اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

اکبر اپنے کلام میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ جہاں ان کا پیام لوگوں تک پہنچ جائے وہاں فن کو بھی ٹھیس نہ لگے ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی فنکارانہ نزاکت کا قائم رکھنا اور ابلاغ کی سہولت ہے وہ اپنے اسی پیغام کو دوبارہ یوں بیان کرتے ہیں۔

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو!
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

تعلیم کی خوش اسلوبی اور نصابوں کی عمدگی جس کا چرچا ہر جانب ہو رہا تھا اسکی حیثیت کو بھی اکبر نے بے نقاب کیا۔

؎ شیخ کالج چاہیئے دیندار اور صاحب اثر
ورنہ کیسا ہی ہو عمدہ کورس وہ بے سود ہے

اکبر کی حقیقت پسندی کی تائید پروفیسر سید وقار عظیم نے یوں کی ہے

" اکبر نے معاشرتی زندگی کے جن انقلابوں کی طرف یہ مختلف اشارے کئے ہیں ان میں سے اکثر اس لئے پیدا ہوئے کہ ہم نے انگریزوں کی لائی ہوئی معاشرت کے ظاہری حسن سے متاثر، مرعوب اور مغلوب ہوکر اپنے طرز معاشرت کو خیر آباد کہہ دیا اور دین کی قیمت پر دنیا کا گھٹیا سودا کیا۔ آزادی دے کر غلامی مول لی۔ ذلت کو عزت جان کر

اس میں لذت محسوس کی ۔۔۔ ۱ ؎

یوں تو اکبر کے کلیات میں ہزاروں اشعار دینداری کے جذبے کو اپنانے پر منحصر ہیں لیکن اس موقعہ پر ہمیں صرف نمائندہ جذبات کی ترجمانی کرنا تھی اس لئے انہی اشعار پر اکتفا کیا گیا۔ تاہم آخر میں اکبر کا یہ شعر درج کیا جاتا ہے جو ان کے پیغام کا ماحاصل ہے۔

تری تعلیم جو کچھ ہو ہمارا تو سبق یہ ہے
یہ سب فانی خدا باقی خودی پیچھے خدا پہلے

بقول پروفیسر سید عابد علی عابد

" مغربی تعلیم کا یہ رجحان ہمیشہ واضح اور بنیادی رہا کہ یہ انسان کو مذہب سے بیگانہ کرتی ہے اور سکون قلب پیدا کرنے کی بجائے تذبذب انتشار اور وسوسے پیدا کرتی ہے ۔۔۔ ۲ ؎

نسل نو کی حیثیت

مصلحین قوم اور تعلیم نو کے نقیب یہ جانتے تھے کہ فقط اسی طریقہ تعلیم کی بدولت قوم ترقی کر سکتی ہے اور اسے نئی زندگی مل سکتی ہے وہ یورپی قوموں کی طرح علوم سے استفادہ کر سکے گی لیکن تعلیم کے یہ نتائج ہرگز ہمارے سامنے نہ آئے تعلیم نے نئی نسل کو جس ذہنی خلفشار سے دوچار کر دیا اسے بظاہر تو غرت

۱ ؎ ماہ نو صہ ۳۸/۳۷ شمارہ خصوصی مارچ ۱۹۶۲ء " اکبر اور انگریز " سید وقار عظیم
۲ ؎ شعر اقبال صہ ۴۱/۳۹ مطبوعہ بزم اقبال لاہور

کا نام دیا جا سکتا تھا مگر اصل میں یہ عزت، ذلت کے مترادف تھی قوم اس تعلیم کی بدولت نہ مشرقی رہی اور نہ ہی پوری طرح مغربی بن سکی مغرب کا جھوٹا وقار، لباس کی تراش خراش اور رسم ورواج کا اپنا لینا وغیرہ تو قوم کو آ گیا مگر وہ زندہ قوموں کی خصوصیات سے عاری رہی اس کا تجزیہ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے یوں کیا ہے۔

"بڑی چیز زندگی ہے زندگی اور تقلید میں بیر ہے تقلید اقارب کی ہو یا اجانب کی لیکن غلامی کی حالت میں جب قوم پر موت کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اقارب کی تقلید کم سے کم قومی شیرازہ بکھرنے نہیں دیتے اس حالت میں غیر کی ریس سے خطرناک نتائج پیدا ہوتے ہیں اور وہی حالت قوم کی ہوتی ہے جو اردو کی اس کہاوت میں بیان کی گئی ہے کوا چلا ہنس کی چال اور اپنی بھی بھول گیا ——" [1]

اس تقلید کورانہ کا جو نتیجہ نکلا اس کو اکبر نے اپنے یہاں تقابل کی صورت میں اس طرح پیش کیا ہے ——

ملاحظہ ہو ——

سائنس تو تم نے جانا اور اس کو بھی پڑھایا
دولت اڑائی تم نے اور ان سے گپ لڑائی
تم نے تو مال مارا اور کھول دی تجارت
یہ ترجموں میں الجھے بس داستان سنائی

———

[1] نئی پرانی قدریں —— ڈاکٹر شوکت سبزواری ص ۱۴۰

تم متحد ہوئے اور دکھلائی اپنی قوّت
اس نے سلف کو رہنما آپس میں کی لڑائی
تم نے نگاہ رکھی کل اپنے ضابطوں کو
اس بے ادب نے سیکھی بے دینی اور ڈھٹائی
یہ برکتیں تمہاری تعلیم کی بلا ہیں !
مارا ترقیوں نے اللہ کی دُھائی

یہ پرسچ ہے کہ وہ سائنسی تعلیم جس کا نعرہ انگریزی تعلیم کے مؤیدین نے لگایا تھا وہ قوم کے لئے اشد ضروری تھی مگر انگریز نے وہ تعلیم ہمیں اس طرح نہ دی اور نہ ہی وہ دینا چاہتا تھا۔ جیسا کہ یورپ میں رائج تھی سرسید کی نیک نیتی میں شبہ نہیں۔ مگر انگریز کی عیاری اور مکّاری کی زد میں پوری قوم بہہ گئی۔

یا یہ کہیئے کہ

؎ کھلونے دے کے بہلائی گئی تھی

اس تعلیم نے اپنا اصلی کام کر دکھایا کہ ہمارے اسلاف کے کارنامے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہونے لگے۔ ہم نے اپنی قومی میراث کو حقیر جانا۔ اور اس ذہنی غلامی نے اپنا رنگ دکھایا کہ پوری قوم مرعوب ہو گئی۔ اور اپنی تمام روایات کو کھو بیٹھی۔ اس تعلیم کی بدولت ہندوستانی قوم اور بالخصوص مسلمان ملّت پر یہ اثر ہوا کہ یہ مذہب اور دین کا دامن بھی ہاتھ سے چھوڑ بیٹھی۔ اکبر تعلیم کے مخالف نہ تھے مگر اس مغربی تعلیم کے زبردست ناقد تھے اور ایک

ڈاکٹر کی طرح اس نظام کی تطہیر اور صفائی کے متمنّی تھے۔

بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

"مغربی علوم کے سطحی انجذاب کے بجائے وہ ان کے بھرپور علم اور تجربے کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ سائنس ایک تجرباتی علم ہے اور تجربے اور عمل کے بغیر ملک میں جس قسم کی تعلیم کو فروغ دیا جا رہا ہے اس سے ان کے نزدیک کسی دنیوی فائدے کی بھی توقع نہ تھی۔"

ہمارے اہل علم و فہم جن کے ساتھ ہماری بہتر توقعات وابستہ تھیں اور جن سے رہنمائی کی توقع تھی اس تعلیم کی بدولت ان کے شعور پر بھی پردے پڑ چکے تھے۔ اور انہیں اچھے برے کی تمیز نہ رہی تھی وہ قوم کے لئے جو نسخہ تجویز کراتے تھے وہ اس کے حق میں مضر ثابت ہو رہا تھا۔

لیکن اس کے باوجود یہ حضرات اس کی عمدگی کا دم بھر رہے تھے

بقول پروفیسر سید وقار عظیم

"اکبر نے قوم کی اس آخری کیفیت پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ انگریزوں کے پھیلائے ہوئے فریب کو حسن سمجھ کر ہم اس کی طرف لپکے اس کی طرف لپک کر اس کے دام تزویر میں آگئے اور دام میں پھنس کر خود ہی اپنے دام کے حلقوں کو سخت کرنے اور اس میں لذت محسوس کرنے کو اپنا وظیفہ اور شعار بنا لیا اور بالآخر دام کے یہی حلقے ہمارے لئے لطف و انبساط اور لذت و سرود کا سرمایہ بن گئے[1]

---

[1] ماہ نو کراچی مارچ ۱۹۶۲ء "اکبر اور انگریز" پروفیسر سید وقار عظیم

ہُس ہوائے باغ کا ہے اب پروں کو ناگوار
اتنا خوگر ہو گیا ہوں پنجہ صیّاد کا [1]

اکبر نے اپنا پیغام بار بار دہرایا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ اس سے فن کو نقصان نہیں پہنچا جیسا کہ ڈپٹی حافظ ڈاکٹر نذیر احمد کے ناولوں میں مقصدیت نے ان کے فن کو پہنچایا ہے۔ اکبر کو اپنے قاری پر پورا پورا اعتماد ہے۔ وہ اس کی طبیعت سے واقف ہیں لہٰذا ہر بار ایک نئی فنی نزاکت کے ساتھ اپنا پیغام ذہن نشین کراتے ہیں۔ مذکورہ بالا حالت کو اکبر نے پھر یوں واضح کیا ہے جو بیمار قوم کی بے حسی اور بے بسی کا پتہ دیتی ہے۔

طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا
اپنی چونچوں سے جو پھندا کس رہے ہیں جال کا [2]

اس تعلیم نے نئی نسل کو خاصا بے راہ رو کر دیا اور وہ نقل انگریز کو تہذیب ترقی اور شائستگی کے نام سے موسوم کرنے لگی۔ قوم کے قلب و نظر پر مغربی روش کا سایہ بھی پڑا۔ اور یہ اپنے طرز معاشرت کی نسبت انگریزی طرز معاشرت کو اپنانے لگی۔ بقول اکبر۔

---

[1] کلیات اکبر جلد دوم سوم (دیکھا) بزم اکبر کراچی

[2] یہ شعر کلیات اکبر مطبوعہ بزم اکبر کراچی میں یوں لکھا ہے۔

طائروں پر سحر ہے صیّاد کے اقبال کا　　اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا

لیکن میں نے ملّا واحدی (مرتب کلیات) کا نسبت سیّد قاسم محمود [؟] صاحب کی تقلید کی ہے کہ انہوں نے شعر پہلی صورت میں اپنی تحریروں میں درج کیا ہے ہر صورت دونوں طرح مطلب واضح کرتا ہے۔

مغربی رنگ روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم ان کے ہاتھ میں تعلیم ان کے ہاتھ میں

جس رواج سے اکبر نے پناہ مانگی وہ حقیقت میں نقل انگریزی عملی تصویر ہے اس لئے جو لوگ انگریز کی تقلید اور اس کے طرز کی پیروی کو اپنے لئے باعث شرف واعزاز جانتے ہیں ان سے اکبر صاف لفظوں میں یہ کہتے ہیں۔

قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر
اس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو

اکبر نئی نسل کی اس نام نہاد ترقی کو ترقی کہنے سے اس لئے گریزاں ہیں کہ ان کی چشم بصیرت اسے اپنے اصلی روپ میں دیکھ رہی تھی۔

مرے صیاد کی ۔۔ تعلیم کی ہے دھوم گلشن میں
یہاں جو آج پھنستا ہے وہ کل صیاد ہوتا ہے

بوڑھے کو رقص پر کس بات کی میں داد دوں
ہاں یہ جائز ہے مداری کو مبارک باد دوں

آخر میں نئی نسل کی حیثیت پر اظہار تعجب کرتے ہیں کہ جس راہ پر یہ گامزن ہے۔ وہ اسے کس طرف لے جائیگی۔

سوچو کہ آگے چل کے قسمت میں کیا لکھا ہے
دیکھو گھروں میں کیا تھا اور آج کیا رہا ہے

اکبر اندھا دھندے تقلید سے ہٹا کر قوم کو شعوری تقلید کی دعوت دیتے ہیں

یہی وجہ ہے کہ اکبر کا کلام اپنا کام کرتا رہا اور آج بھی اگر ہم غور کریں تو کسی ماہرِ تعلیم نے کوئی ایسی نئی بات نہیں کہی جو اس سے پہلے اکبر نے اپنے انداز میں نہ کہی ہو۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی۔

" اکبر جو باتیں اپنے انداز میں کہہ گئے تھے اقبال نے وہی باتیں حکیمانہ انداز شاعرانہ حسن اور شاہانہ جلال کے ساتھ تیس سال بعد کہی ہیں ـــــ " [۱]

ہشیار رہ کے پڑھنا اس جال میں نہ پڑنا
یورپ نے یہ کہا ہے یورپ نے وہ کہا ہے

فلسفہ میں کیا دھرا ہے گھر کا ہو یا لندنی
سعی کا موقعہ ملے تو آرٹ یا سائنس کو دیکھ

عزم کر تعلیمِ مغرب کا ھنر کے زور سے
لطف کیا ہے لدلئے موٹر یہ زر کے زور سے
غیر ملکوں میں ہنر کو سیکھ تکلیفیں اٹھا
رد کئے ہیں وہ اگر اپنے اثر کے زور سے

ایک جانب اکبر کے یہ اشعار قوم کو پیغام دیتے ہیں مگر یہ پیغام قومی حالت

---

[۱] حیاتِ اکبر ص ۱۴۷ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔

کا نقشہ بھی کھینچتا ہے اور اسے من و عن قوم کے سامنے رکھتا ہے اور قوم کو اس بات کی دعوت دیتا ہے۔ اَفلا تعقلون ہ حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم نے بھی اکبر کی اس بصیرت کا اعتراف بڑی فراخدلی سے کیا ہے۔

"اکبر اس آنے والے ذہنی انقلاب کو بہت پہلے محسوس کر چکے تھے اور جدید مغربی علوم کے سطحی انجذاب کے نتیجے میں قومی زندگی میں جن قباحتوں کے پیدا ہونے کا خدشہ تھا ان سے قوم کو آگاہ کر چکے تھے" [1]

تعلیمِ نو اور ہمارا تہذیبی و تاریخی ورثہ

تاریخی اور تہذیبی ورثہ، اسلاف کی روایات اور ان کے مقدس کارنامے قوموں کی زندگی کا اثاثہ ہوا کرتے ہیں۔ قوموں کا وجود ان کے وجود سے منسلک ہوتا ہے جب تک روایات اور یہ تہذیبی ورثہ زندہ رہتا ہے۔ قومیں زندہ رہتی ہیں ــــ **تعلیم کیا ہے** ــــ؟ اپنی روایات، تاریخ اور تہذیبی ورثے کا اعادہ ــــ! جب بھی کوئی نظام تعلیم اس ورثے سے اپنا تعلق منقطع کر لیتا ہے تو وہ اس خاص قوم کا نظام تعلیم نہیں ہوتا جس کا وہ ورثہ ہوتا ہے بلکہ وہ کسی نئی قوم کے خیالات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر لینے کے بعد اسی قوم کا بن جاتا ہے۔ انگریز کبھی یہ نہ چاہتا تھا کہ وہ ہمیں ایک ایسا نظام تعلیم دے جس کی بناء پر ہم اپنے شاندار ماضی تاریخ اور روایات سے فائدہ اٹھا سکیں اس نے ہماری

---

[1] ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر پنجاب ریویو ص۱۰ اپریل ۱۹۶۱ء ترجمہ مولانا ظفر علیخان مرحوم

تاریخ میں، ترامیم کیں اور ان کے ساتھ ہمارے نوجوانوں کے سامنے پیش کیا۔ ہماری روایات کا وہ نقشہ کھینچا۔ جس سے نفرت کا جذبہ پھوٹے اور پھر اس کی جگہ مغربی علوم و فنون کے نام سے اپنی تاریخ کو دی۔ اس پر ظاہر یہ کیا گیا کہ ہم آپ کو متعارف کر رہے ہیں جب کہ اس کے پس پردہ ذہنی غلامی کا جال بچھانے کی خواہش موجزن تھی۔

میکالے رپورٹ نے یہ مقصد پوری طرح انجام دیا پوری قوم کا اندازِ فکر اس سے متاثر ہوا وہ اسیرِ صیّاد ہو گئی اور اس کو یہ اسیری اس طرح راس آئی کہ اسے ہوائے گلشن بھی ناگوار گزرنے لگی۔

ع مس ہوائے باغ کا ہے اب پروں کو ناگوار

بقول سیّد وقار عظیم

"ہندوستان اور ہندوستانیوں پر حکومت کرنے کے زمانہ میں انگریز کی سیاسی شخصیت اور کردار کے جو رخ ہمارے سامنے آئے ان میں چالاکی و عیّاری بے التفاتی و بے نیازی بے اعتباری و بدگمانی کے وصف سب سے نمایاں ہیں سیاسی حکمت کے ان اوصاف نے جب عمل کی صورت اختیار کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی ہر طرح کی آزادی سے محروم ہو گیا اور یہ محرومی طرح طرح کے ردّ عمل کی صورت میں ظاہر ہوئی کبھی ہندی کا غم دل نالہ و فریاد بن کر نکلا کبھی اس نے خاموشی میں مصلحت جان کر اسے اپنا وطیرہ بنایا کبھی خوشامد کو پناہ کا وسیلہ سمجھ کر اس سے سپر کا کام لیا اور کبھی یہ بھی ہوا کہ ہندوستانیوں پر انگریز کا سحر یوں چلا کہ وہ خود آپ اپنے میں صیّاد بن گئے اور گلچینی کا

جو منصب انگریزوں کیلئے خاص تھا اس میں مہارت حاصل کر کے اپنے چمن کی شاخوں کو خود کاٹنا اور اس کے پھولوں کو خود روندنا شروع کردیا [1]

سیّد وقار عظیم صاحب کا یہ تجزیہ کتنا حقیقت پسندانہ ہے کہ ہم میں سے اکثر خود اپنے آپ میں صیّاد بن گئے ہم نے خود اس چمن کو لوٹا اس کے حق میں وہ رویّہ روا رکھا جو غیر کو رکھنا چاہیئے تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ بہ صرف یہی کہ ہماری مقدس روایات اور ہمارا تہذیبی ورثہ ہماری نظروں میں بے وقعت تھا اور سبب یہ کہ جو گھٹیا قسم کی تعلیم ہمیں دی جارہی تھی اس سے مقصود یہی کچھ تھا اس سے متعارف کرانے والوں نے خود اس طریق تعلیم کو اپنے خطوط پر استوار کیا تھا۔ اس بے حسی کا احساس اس عہد کے بہت کم مصلحین کو تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اکبر کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ان الفاظ کو دہرانے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ " وہ ایک لحاظ سے سرسید سے آگے دیکھتے تھے اور ان سے زیادہ دیکھتے تھے۔" [2]

قوم کے شعور اور تحت الشعور میں حکمرانوں کی برتری کا سکّہ بیٹھ گیا اور بے چاری قوم اپنے شاندار ماضی کو بھلا بیٹھی

بقول اکبر

وہ حافظہ کہ مناسب تھا ایشیا کیلئے
خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا!

---

[1] ماہ نو کراچی ص ۳۸ مارچ ۱۹۶۲ء

[2] پروفیسر رشید احمد صدیقی حیاتِ اکبر صفحہ ۱۴۱

قومی ورثے سے ہماری بیگانگی ـــ اکبر کیلئے اور ہر صاحب فکر کیلئے خاصی دلخراش تھی سر سیّد تحریک کے حامیوں نے تہذیب حاضر کی چمک اور دلفریبی کو دیکھا تھا مگر اس کے اثرات کا بنظرِ غائر مطالعہ نہ کیا تھا۔ انہوں نے اسے قوم کے لئے مفید سمجھا حالانکہ یہ سودا ہمیں خاصہ مہنگا پڑا۔ اکبر تعلیم نو کی افادیت سے منحرف نہ تھے مگر اس کی مضرتوں سے بھی آگاہ کرنا چاہتے تھے کیونکہ اس تعلیم کا تعلق ہماری میراث سے کچھ زیادہ نہ تھا بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی۔

" اکبر کا یہ عقیدہ تھا کہ علیگڑھ کو مغرب کی پیروی آنکھ بند کر کے نہ کرنی چاہیئے اور مغرب کی برکات سے فائدہ اٹھانے میں خود اپنی میراث کی طرف سے غفلت برتنا مناسب نہیں۔ بذات خود میں یہ نہیں مانتا کہ اکبر علیگڑھ اور سر سید پر کسی تنگ نظری یا رجعت پسندی کی بناء پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ ان کی نظر قوم کی میراث پر بھی تھی اور قوم کی تقدیر پر بھی توم کی تقدیر توم کی میراث سے علاحدہ نہیں کی جاسکتی حالی اور اقبال دونوں اسے ملتے ہیں " [۱]

اکبر نے علیگڑھ میں رہ کر نزدیک سے اس نظام تعلیم کا مطالعہ کیا تھا اور اپنے بیٹے عشرت حسین کو لندن بھیجنا بھی مصلحت سے خالی نہ تھا اس کا اعتراف سید عشرت حسین خود کرتے ہیں۔

" مجھے ولایت بھیجنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مغربی تعلیم اور اس کے اثرات کو اس طرح سمجھ جائیں جیسے اثر خود ان پر پڑ رہا ہے مغربی تعلیم کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی اس سے بڑھ کر کیا صورت ہو سکتی تھی " [۲]

---

۱ علیگڑھ میگزین اکبر نمبر ص ۱۰-۱۱ ۲ حیات اکبر ص ۷۱

خواجہ حسن نظامی دہلوی بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ

"حضرت اکبر نے عشرت میاں کے سفر لندن سے بہت کچھ سیکھا اور پھر اپنی قوم اور ملک کو بہت کچھ سکھایا۔" [۱]

اکبر کی وفات ستمبر ۱۹۲۱ء کو ہوئی انہوں نے، اگرچہ وہ عمر میں سرسید سے چھوٹے تھے، پورے تیس سال تک اس نئی تعلیم کے اثرات و نتائج کو بڑے غور اور انہماک سے دیکھا اور نتائج اخذ کئے ان کو محض ذاتی مطالعہ نہ بنایا بلکہ قوم کو اس سے آگاہ بھی کیا۔

مثال کے طور پر اکبر فرماتے ہیں۔

اس بازی کو ہمیں نے شہ دی
یہ کیسے سیّد ، یہ کیسے مہدی
تڑپو گے جتنا جال کے اندر
جال گھسے گا کھال کے اندر
کیا ہوا تیس ہی سال کے اندر
غور کرو اس حال کے اندر

یہ اکبر کی منصف مزاجی ہے کہ وہ اس نئی تعلیم کو سرسیّد احمد خان اور اُن کے رفقاء محسن الملک اور وقار الملک کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ نہیں گردانتے اور انہیں بذاتہٖ مورد الزام نہیں ٹھہراتے بلکہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔ کہ

---

[۱] حیات اکبر صـ۲ فٹ نوٹ خواجہ حسن نظامی دہلوی

؏ اس بازی کو ہمیں نے شہ دی

پوری قوم اس ذہنی غلامی کو اپنانے کے حق میں تھی۔ خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا اکبر نے یہ ہمیں بتایا کہ تیس سال کے عرصہ میں ہم نے کیا کھویا کیا پایا۔ محل غور تو یہ بات ہے نتیجتہً ہماری کوئی منزل نہ رہی اور ہم بے مقصدیت کو اپنانے لگے۔

؏ یہ سڑک کس سمت میں آخر نکالی جائے گی
آنے والی نسل کس سانچے میں ڈھالی جائے گی

نئی تعلیم کی بدولت ہم نے شیخ و مسجد سے جو ہماری تہذیب کے نمائندے تھے اپنا تعلق توڑ لیا

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا

اس روشِ تقلید کا تجزیہ اکبر نے جا بجا اپنے اشعار میں کیا ہے کہ کیا میراث قومی کو ترک کرنے کے بعد ہمیں نئی روایات کے اپنانے سے کچھ فائدہ بھی ہوگا یا نہیں۔

میں نے کہا یہ اپنے خیالی خضر سے آج
بتلاؤ اس روش سے ترقی کی کیا امید
ہر گام پر جو طاقت حق سے الگ پڑا
ہوتے رہوگے مرکز قومی سے تم بعید
ہاں انتشار و جہل کی تکمیل ہوگی جب
ہو جاؤگے بتان کلیسا کے تم مرید!

شاید کہ مدّعا بھی تمہارا ہے بس یہی
ہر چند ابھی ہے درس کے پردے میں ناپدید
حیرت سے مجھ کو دیکھ کے ان خضر نے پڑھا
حافظ کا اک یہ شعر کہ معنی کو تھا مفید
سرّ ازل کہ عارفِ سالک بہ کس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

یہی وہ اسٹائل ہے کہ جس کو اقبال نے بعد میں اپنایا حافظ اور رومی کے اشعار کو اپنی فکر کی مالائیں پرودیا بہرحال اس دوری اور بعد کا تجزیہ اکبر نے کرکے ہمیں اس نظام تعلیم کے اس پہلو سے بھی آشنا کردیا ہے۔

تعلیم کا مقصد خود آگاہی وخود شناسی

تعلیمات اسلامی کا پہلا اور بنیادی اصول خود شناسی اور خود آگاہی ہے جس کو احادیث میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ مَنْ عَرَفَہٗ نفسہ فقد عَرَفَ رَبَّہٗ نئی تعلیم میں تعلیم کے اس روحانی پہلو کو ذرا بھر بھی عمل دخل نہ تھا یہ تعلیم بالکل میکانکی اور مادی اصولوں کے تابع تھی اکبر نے اس بہت بڑے خلاء کو محسوس کیا اور قوم کی توجہ اپنی تعلیمی اساس کے اس گرانقدر پہلو کی طرف دلائی یہ خود آگاہی اور خود شناسی ان کے نزدیک صرف دنیاوی ترقی کا راز تھی بلکہ وجدان حقیقی اور معرفت الٰہیہ کا زینہ بھی تھی

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا ہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اپنے ایک اور شعر میں اکبر اسی بات کو اور واضح کرتے ہیں کہ تعلیم بدل جانے سے آدمی کے قلب کی ماہیت بھی بدل جاتی ہے اور وہ اپنی خودی کو بھلا دیتا ہے۔ خود شناسی اور خود آگاہی کی خصوصیات مٹ جاتی ہیں اور ان کا فقدان ہی قوموں اور افراد کی نظریاتی موت ہے۔

شیخ مرحوم کا قول اب بھی مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

خودی کا یہ احساس اور شعور زندگی کی حرارت کو برقرار رکھتا ہے اس کے کھو جانے سے قوموں کی انفرادیت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور ان کا پورا تشخص بدل جاتا ہے انگریز اپنے ساتھ یورپ سے کوئی لمبی چوڑی فوج نہ لایا تھا بلکہ اس نے اپنی تعلیم کی بدولت ہندوستانیوں کی ذہنیت کو بدل ڈالا اور رفتہ رفتہ جدید طبقہ بلا تخصیص مذہب و ملت انگریز کی طاعت کو اپنا کیش اور اپنا ایمان جاننے لگا

بدنام کرو نہ وضع انگریزی کو
پتلون پہن کے ترک طاعت نہ کرو

بات ترک طاعت تک ہی نہ رہی بلکہ اس سے آگے بڑھی اور ہم خود انگریز کا ضمیر بن گئے۔ انگریز اس ضمیر کا مالک تھا اور ہماری ہر صدا اس ضمیر کے تابع تھی ہماری شخصی رائے وہی تھی جو سرکار کی —— ہمارا قومی نعرہ وہی تھا۔ جو

ایک سفید فام حاکم کا تھا۔

مجھ پہ ہے تقلید واجب ہند کے دربار کی
رائے میری بھی ہے وہی جو رائے ہے سرکار کی

اس طرح نئی نسل کی حیثیت محض نقال طبقے کی سی ہو گئی۔ ماہرین فن اور ادیبوں کا کہنا ہے کہ ڈراموں میں جو نقالی کی جاتی ہے اس کا اثر شخصیت پر برا پڑتا ہے چہ جائیکہ ہمارا پورا معاشرہ ہی ڈرامہ کھیل رہا ہو جس کے کردار ہم سب افراد ہوں۔ اکبر اس نقالی کو ہماری خودی اور انفرادیت کے لئے زہر قاتل جانتے تھے۔ اس لئے آپ نے ہر طریق سے خبردار کیا۔

آگاہ ہوں معنیٔ خوش اقبالی سے
واقف ہوں بنائے رتبہ عالی سے
شرطیں عزت کی اور ہیں اکبر
چلتا نہیں کام صرف نقالی سے

اس نقالی نے ہمیں اس حد تک متاثر کیا کہ ہم اپنے اسلاف کی روایات کو بھول گئے وہ نسلی افتخار جو ہمارا طرۂ امتیاز تھا ہم اس کو بھی فراموش کر بیٹھے اکبر پھر ہمارے دامن کو جھنجھوڑتے ہیں۔

بوئے گل میں فسوں ہی وہ نہ رہا
موسم بدلا جنوں ہی وہ نہ رہا
سینے میں وہ دل کہاں سے آئے اکبر
جب اپنی رگوں میں خون ہی وہ نہ رہا

اس تعلیم کی بدولت ہماری انفرادیت ایسی مٹی کہ ہمارے اہل دانش حتّٰی کہ خود سر سیّد احمد خان کے ہمنوا بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ جو کچھ وہ چاہتے تھے وہ نہ ہو سکا ہماری طبیعتوں کا رنگ اکثر بدل گیا اس تبدیلیٔ وضع کے بارے میں طالب الٰہ آبادی یوں رقمطراز ہیں کہ

"غدر کے بعد طبیعتوں کا رنگ بالکل بدل گیا تھا، تعلیم معاشرت اعتقادات اخلاق وضع سب کے سب مغرب کی کورانہ تقلید میں ملفوف ہو گئے تھے زبان پر انگریزی کے غیر ضروری الفاظ جن کے لطیف مترادف اردو میں موجود تھے چڑھے ہوئے تھے۔

مت بولو ایسا بات کہ ہم ڈیسی لوگ ہے
"صاحب" کا نام ڈل کو بہت بھاتے مانگٹا
ہم باپ ڈاڈا لوگ کو پاگل بنا دیا
یورپ کا ڈھنگ ہند میں پھیلانے مانگٹا
اکبر نے صاف کہہ دیا کیا خوب یہ غزل
جو لیڈی لگ باجے پر ہے گانے مانگٹا" [۱]

خود آگاہی کے جذبے کو اکبر کسی صورت میں بھی بھولنے کے قائل نہ تھے اکبر یہ جانتے تھے کہ صرف خود شناسی اور خود آگاہی کی بدولت قوم زندہ رہ سکتی ہے

[۱] اکبر الٰہ آبادی از طالب الٰہ آبادی صہ ۹۷

اور تعلیم کو اس صفت سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔

تعلیم اور فکر معاش

فکر معاش تعلیم کے گھٹیا مقاصد میں سے ایک ہے فکر معاش نئی تعلیم کا بنیادی مقصد تھا سر سید مسلمانوں کے لئے تعلیم چاہتے تھے اور اس کی بدولت ایک شعور آزادی مگر اس تعلیم کے عطا کرنے والے ہندوستانیوں کیلئے تعلیم چاہتے تھے اور اس تعلیم کی بدولت دفتروں کے مشینی کل پرزے —— قوم تعلیم چاہتی تھی صرف فکر معاش کیلئے اکبر کے یہاں اس بات کا خوب تجزیہ ملتا ہے وہ تعلیم کے اس گھٹیا مقصد سے نقاب کشائی کرتے ہیں آج بھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہمیں نوکریاں نہ ملتیں اور ہم دفتروں میں جگہ نہ پاتے تو شاید آزادی حاصل نہ کر سکتے اور ہماری حالت آج یہ نہ ہوتی وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس کے علاوہ بھی زندگی بسر کرنے کی کئی راہیں موجود ہیں اور تعلیم نے ہمیں ہمارے شعور آزادی سے بے بہرہ کر دیا۔ نوکریاں بذات خود غلامی پھیلانے کا ایک ذریعہ تھیں۔

بقول پروفیسر آل احمد سرور

• اکبر چونکہ سر سید کے مخالف تھے اس لئے ان چیزوں کو زیادہ بہتر طور پر دیکھ سکتے تھے چنانچہ موجودہ نظام تعلیم ہمیں کس قدر دے سکتا ہے اور یہ کس قدر ہمارا ہے اور کس قدر ہمارے حاکموں کا، انگریزوں سے قربت، انگریزوں کے ساتھ پابندی کے کس حد تک مترادف ہے۔ علیگڑھ مسلمان کتنے پیدا کر رہا ہے اور کلرک کتنے یہ اکبر کی نظر سے پوشیدہ نہ تھا[1]

---

[1] پروفیسر آل احمد سرور نئے اور پرانے چراغ صہ ۲۴۲

اکبر سرکاری نوکری کو زوال قوم کی ابتدا گردانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انگریزوں کے نزدیک بھی تعلیم کا ایک خاص نظام پھیلانے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو اس سے فیض پہنچانے کا مقصد یہ حاکمانہ دور اندیشی تھی کہ تعلیم حاصل کرکے وہ ملکی نظم و نسق کی مشین کے کل پرزے بن سکیں اور اسے چلتا رکھنے کی خدمت انجام دیں۔ بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

"حصول تعلیم کے بعد سرکاری نوکری کی تلاش ایسی ذہنیت اور روایت بن چکی تھی جو مصلحین قوم کے نزدیک بھی خوش آئندہ نہ تھی کیونکہ ان کا مقصد بھی یہ نہیں تھا" [۱]

خواہانِ نوکری نہ رہیں طالبانِ علم
قائم ہوئی ہے رائے یہ اہلِ شعور کی

گویا تعلیم ایک کے لئے محض روزی کمانے کا وسیلہ تھی اور دوسرے کیلئے پابند اور حلقہ بگوش بنانے کا طریقہ تھی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ تعلیم ایک اعلیٰ و ارفع اخلاقی و روحانی قوت و محرک کا کام کرنے کی بجائے ادنےٰ قسم کے مادی اور دنیاوی مقاصد کے حلقے میں مقید ہو کر رہ گئی اکبر جیسے لوگوں نے حاکم اور محکوم دونوں کو مخاطب کر کے بلا جھجک انہیں بتایا کہ اس تعلیم کے پیچھے کون سے ادنےٰ محرکات کام کر رہے ہیں اکبر نے اس ضمن میں جتنی باتیں

---

[۱] اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر ص ۳۷/۵۳۶

کہی ہیں ان میں سے چند خاص طور سے ایسی ہیں جو تعلیم کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس کا منبع و مرکز دنیاوی غرض مندی اور مصلحت اندیشی ہے اور ان کا تعلق انگریز اور اسکی رعایا کے باہمی رشتے کے اس رخ سے ہے جس میں ایک طرف فریب دہی اور عیاری ہے اور دوسری طرف سادہ لوحی اور فریب خوری ——— لے

سادہ لوحی کی اس رو میں بہہ کر بعض لوگ آج بھی یہی کہتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے کے نتیجے کے طور پر انہیں سرکاری نوکری ملی اکبر نے اپنے اشعار کے ذریعہ تعلیم کے رُخ زیبا پر پڑے ہوئے ان پردہ ہائے فریب کو چاک کیا ہے۔

بقول پروفیسر سید وقار عظیم

"ہم نے انگریزی پڑھنے اور روزی کمانے میں لازم و ملزوم کا جو رشتہ قائم کیا ہے وہ حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لینے کا نتیجہ ہے۔" ٢ے

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر آدمی جو انگریزی پڑھ لیتا ہے اسے نوکری کا مل جانا ضروری امر نہ تھا۔ بقول اکبر

ہیں عمل اچھے مگر دروازۂ جنت ہے بند
کر چکے ہیں پاس لیکن نوکری ملتی نہیں
کالج سے آ رہی ہے صدا پاس پاس کی!
عہدوں سے آ رہی ہے صدا دور دور کی

لے ماہ نو کراچی مارچ ۱۹۶۲ء سید وقار عظیم ۔ اکبر اور انگریز ص ۳۵

٢ے " " " " " " " " "

دوسری یہ بات کہ انگریزی پڑھنا روزی حاصل کرنے کی شرط ہرگز نہیں

بدن میں روح آجاتی ہے جب بے گوری رنگت کے
تو بے انگلش پڑھے روٹی بھی مل سکتی ہے نیٹو کو

اکبر امید روزگار کو صرف نوکری سے وابستہ نہیں سمجھتے اور انگریزی تعلیم کو اس کے حصول کا ذریعہ نہیں جانتے بلکہ ان کے یہاں اور بھی وسائل ہیں کہتے ہیں کہ ۔

اسلاف کی تاریخ و روایت کو دیکھو
کچھ پڑھ کے تو صنعت و زراعت کو دیکھو

وہ ہمیں صنعت و زراعت پر توجہ دینے کی ترغیب دیتے ہیں کہ اپنے وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤ۔ اگر ہم اسے حقیقت بھی مان لیں کہ انگریزی پڑھنے سے ملازمت ضرور مل جائے گی تو اس طرح کی ملازمت میں جو بہت سے اخلاقی اور دینی خسارے ہیں ان کی تلافی کسی طرح نہیں ہو سکتی۔

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

اور پھر یہ کہ

تیری تنخواہ بڑھی شکر ہے لیکن اے دوست
تیری تو کچھ ترقی نہ ہوئی تنخواہ کے ساتھ

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ

مذہب چھوڑو ملت چھوڑو، صورت بدلو، عمر گنواؤ
صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت توبہ توبہ ۔

بقول پروفیسر سید وقار عظیم

"انگریز نے ملک میں ایک خاص طرح کا نظام تعلیم پھیلا کر مدرسوں اور کالجوں کو کلرک بنانے اور تیار کرنے کا کارخانہ بنا دیا۔ اور اس طرح اس کا کاروباری اور سرکاری مقصد پورا ہو گیا اور اسکے بدلے میٹو کو روٹی بھی مل گئی۔" [۱]

مگر یہ سودا ہمیں بہت مہنگا پڑا، ہمیں اپنی اعلےٰ دارفع اقدار کی قربانی دینا پڑی اور مادی ترقی ہمارے روحانی تنزل کا پیش خیمہ ثابت ہوئی

شخصیات کا اثر اور طریقۂ تعلیم

نئی تعلیم کی اساس اور بنیاد نصابوں پر ہے اور اسکی بدولت ہم ڈگریاں اور سندیں حاصل کرتے ہیں جبکہ ہمارے پرانے طریقہ تعلیم میں اسناد کی اہمیت یہ نہ تھی اشخاص اپنے طلبا کی شخصیتوں کو بناتے تھے ایک پوری شخصیت دوسری شخصیت میں بدل جاتی تھی اسکے افکار و خیالات و نظریات کا خزانہ طالب علم کا سینہ اور ذہن ہوا کرتا تھا۔ استاد کی شخصیت جمیع الصفات ہوتی تھی اور ان صفات کا اثر طالب علم کی شخصیت پر پڑتا تھا استاد اپنے طالب علموں میں حق گوئی بے باکی اور راست گوئی کی صفات پیدا کرکے اس کی شخصی تربیت کرتا تھا اور تدریس کے ذریعہ اس کے سینے میں علوم کو جگہ دیتا تھا خود رسول اکرم کے عہد میں اصحاب صفہ اعلےٰ درجے کے عالم تھے۔ ان کی شخصیات کو رسولؐ کی صحبت نے

---

[۱] ماہ نو کراچی مارچ سنہ ۶۲ء سید وقار عظیم

جنم دیا اور انہوں نے امتِ مسلمہ کے لئے علمی اور نظری ہر لحاظ سے مکمل مبلغین اور بہتر انسانوں کو جنم دیا۔ یہی طریقۂ تعلیم ہمارا روائتی سرمایہ تھا اور برصغیر میں نئی تعلیم کے اجراء تک جاری رہا۔ خود مولانا شبلی نعمانی جیسے استاد نے مولانا سید سلیمان ندوی جیسے شاگردوں کو جنم دیا اس طرح یہ سلسلہ اپنی روایات کے ساتھ کسی نہ کسی طریق پر زندہ رہا۔

بقول منظفر علی سیّد

"اس زمانے میں استاد اور شاگرد کے درمیان ایک تو ذوق و شوق کا رشتہ تھا دوسرے تربیّت دینے والے زبان کے ساتھ ساتھ ذات کی تربیّت پر بھی زور دیتے تھے شاگرد کی پوری شخصیت استاد کے ہاتھ میں تھی اس مٹی سے اوران ہاتھوں سے اچھے رتن کیسے نہ بنتے۔"[1]

اکبر نئی تعلیم کی برکتوں کے سرے سے مخالف نہ تھے مگر وہ اسمیں اپنی ضروریات کے شمولیت کے خواہشمند تھے کہتے ہیں کہ

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی آدمی بناتے ھیں
جستجو ہم کو آدمی کی ہے
وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں

نئی تعلیم میں شخصی توجہ کا پہلو اس طرح موجود نہ تھا جیسے کبھی ہمارے اں تھا استاذ کی شخصیت ادب کی مستحق تھی استاد ہی سب سے بڑا رہنما اور ہمارے معاشرے

---

[1] رسالہ شعور کراچی ص ۱۵۰/۱۵ مضمون کھوٹا کھرا "منظفر علی سیّد

کا مقدس ترین اور قابل تقلید فرد تھا انگریز کو سب سے بڑا خطرہ استاد سے پیدا ہوا کیونکہ استاد ہی مذہبی میدان میں بھی مسلمانوں کا راہ نما تھا اور دینوی علوم کا مرجع بھی اسی کی ذات تھی اس لئے انہوں نے اس نظام کو بدل دینا چاہا اور بزبان اکبر یوں کہیئے کہ

ع مستحقانِ ادب کو آپ نے رسوا کیا

تعلیم نسواں اور اکبر

پروفیسر سرور کا یہ کہنا کہ " اکبر مغربی تعلیم کو لڑکوں کیلئے مضر جانتے ہیں تو لڑکیوں کے لئے زہرِ قاتل ـــــ اس لئے ان کے تہذیب سے سنورنے اور تعلیم سے [illegible] کو بُرا کہتے ہیں " ۱

سرور صاحب کا یہ قول اپنی جگہ بہت وقیع ہے اکبر اس نظام تعلیم کو جو سرسید تحریک کے زیر اثر اور حاکموں کی ذرّہ نوازی کے تحت برّصغیر میں متعارف کرایا جا رہا تھا موزوں اور مناسب نہ جانتے تھے انہوں نے اس کی مضرّتوں کی طرف نہ صرف اشارہ کیا بلکہ لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں بالخصوص واضح خطوط متعین کئے کہ تعلیم نسواں کی کیا اہمیت ہے اور اس کا طریق کار کیا ہو اکبر کہتے ہیں کہ ع کون کہتا ہے کہ تعلیم زناں خوب نہیں

ایک ہی بات فقط کہتا ہے یاں حکمت کو

---

۱ نئے پرانے چراغ ص ۲۴۲

دوائے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

اکبر تعلیم نسواں کی افادیت کے قائل ہیں وہ اس کے ساتھ یہ پتے کی بات کہتے ہیں کہ عورتوں کو اپنے اہل و عیال کی پرورش کیلئے اور شوہر کی علمی معاونت کے لئے ضرور تعلیم دینی چاہیئے۔ مگر قوم کے واسطے تعلیم نہ دینی چاہیئے۔ تاکہ یہ نوبت نہ پہنچے کہ

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر
شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

اسلامی شرم و حیا اور پردے کی روایت کو وہ اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور قدم قدم پر ان کے بقاء اور احیاء کی آواز کو بلند کرتے ہوئے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہیں۔

تعلیم دختراں سے یہ امید ہے ضرور
ناچے دلہن خوشی سے خود اپنی برات میں

تمہاری تعلیم کے مصالح جو چاہیں برسائیں ان پہ شوخی
مری نظر میں تو حسن یہ ہے کہ چشم خوباں سے شرم ٹپکے

وہ پھر یوں فرماتے ہیں کہ

اللہ ہی ہے ان لڑکیوں کا فرفر بھی بنیں حد میں بھی رہیں
ہے کورس بھی ان کا اسکی اور پاس شدہ استانی بھی

اکبر یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ لڑکیوں کے کورس کی بھی حاکموں نے بڑی خوبی سے پلاننگ یا منصوبہ بندی کی ہے اور ان کو پڑھانے والی استانیاں بھی ایک خاص انداز سے تربیت یافتہ ہیں اب ان کی اس پوری اسکیم کا اثر قوم کے حق میں کچھ مفید نہ ہوگا ایسے میں اکبر صرف اظہار تاسف نہیں کرتے بلکہ اپنی جانب سے حل بھی تلاش کرتے ہیں۔

تعلیم یافتہ ہوں اور نیک بخت بھی ہوں
تم سے رہیں ملائم شیطاں پہ سخت بھی ہوں
قرآن ہی کرے گا ان بیبیوں کو پیدا
پاکیزہ تخم جب ہوں عمدہ درخت بھی ہوں

مائیں جبھی اچھے بچوں کو جنم دے سکتی ہیں اگر وہ تعلیمات اسلامی کے ساتھ وابستہ رہیں اور وہاں سے اپنے نخلستانوں کو سینچیں کیونکہ اچھی مائیں ہی زندہ قوموں کو جنم دے سکتی ہیں۔ نپولین نے بھی اس حقیقت کا اعتراف اپنی ایک تقریر میں کیا تھا کہ۔

"تم مجھے اچھی مائیں دو میں تمہیں ایک عمدہ قوم دوں گا" اچھی مائیں تعلیم ہی پیدا کر سکتی ہیں اور اکبر کے ہاں صرف اسلامی اقدار سے ہی ہم آہنگ تعلیم ہی یہ فرض انجام دے سکتی ہے۔

یوں تو اکبر نے لاتعداد شعر تعلیم نسواں پر لکھے ہیں لیکن ذیل میں اکبر کی ایک نظم درج کی جاتی ہے جو ان کے خیالات کی پوری پوری نمائندگی کرتی ہے بڑے ہی مربوط انداز سے ان کے تفکرات ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے
حُسنِ معاشرت میں سراسر فتور ہے
اور اس میں والدین کا بیشک قصور ہے
ان پر یہ فرض ہے کہ کریں کوئی بندوبست
چھوڑیں نہ لڑکیوں کو جہالت میں شاد و مست

کھانا پکانا جب نہیں آیا تو کیا مزا
جوہر ہے عورتوں کے لئے یہ بہت بڑا
لندن کے بھی رسالوں میں میں نے یہی پڑھا
مطبخ سے رکھنا چاہیئے لیڈی کو سلسلہ
وقت آپڑے تو گاڑھے گزی میں عذر کیا
گھر کے لئے طعام پزی میں بھی عذر کیا

پبلک میں کیا ضرور کہ جا کر تنی رہو
تقلیدِ مغربی پہ عبث کیوں ٹھنی رہو
داتا نے دھن دیا ہے تو دل سے غنی رہو
پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی بنی رہو

مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے زور نقش کا اسکول اور ہے

اکبر نے صحیح معنوں میں اصلاحی جذبے کی روح کو اپنایا انہوں نے سوئی ہوئی قوم کو جھنجھوڑا، جو سوتے میں بے شعوری کی حالت میں طوفان مغرب میں بہی جا رہی تھی اس طوفانِ بے تمیزی کی مخالفت بھی ہوئی مگر بڑے بھونڈے انداز میں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس غیر مناسب مخالفت سے بھی کنارہ کر گئے اور انہیں صحیح راہ نمائی کے بہت کم مواقع ہاتھ آئے جس طرح مغرب زدہ لوگ اور ایسی ہی تحریکوں کے حامی ہر چیز کو دنیا سے بلند تر جانتے تھے جو مغرب سے آئی ہو اسی طرح اس طوفان بے تمیزی کی مخالفت کرنے والے علماء اور صلحا ہر چیز کو بجواس غیر صحت مند اور کفر کی حدود کو چھوتی ہوئی فکر کا لیبل چسپاں کر کے رد کر دیتے

غرضیکہ دونوں طرف انتہائی رویہ اختیار کیا جا چکا تھا اور ظاہر ہے۔ کہ انتہا پسندی کبھی بھی سودمند ثابت نہیں ہو سکتی۔ نتیجۃً قوم نے یا تو اعلےٰ درجے کے غدار سر خان بہادر، راجے مہاراجے اور نواب و نوابزادے پیدا کئے یا کٹر قسم کے مولوی جو اپنے خلوص میں اعتدال سے کوسوں دور چلے گئے ضرورت ایک درمیانی راستے کی تھی جو سرے سے ہی مفقود تھا۔ یہ اعتدال ہمیں بہت حد تک اکبر کے یہاں ملتا ہے بقول طالب الہ آبادی

"اکبر فطرتاً اعتدال پسند تھے وہ نہ تو سر سید کی عظمت اور ان کے کام کی عظمت سے چشم پوشی کرتے تھے نہ بے جا حملوں کی عادت تھی وہ روشن ضمیر تھے اور چاہتے تھے کہ انقلابات بتدریج ہوں۔" [1]

---

[1] اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر ص ۱۹۰

بہت کم لوگوں کے ہاں توازن کا یہ شعور اور احساس تھا اکبر کے کئی معاصرین نے اپنی فطرت کو تو متوازن رکھا مگر دوسروں کو ان کے اس توازن سے کچھ زیادہ فائدہ نہ ہوا ان لوگوں میں ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کا نام سرفہرست آتا ہے بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

• اگرچہ نذیر احمد کے معاشرتی ناولوں کا انداز اکبر کے انداز کے زیادہ قریب ہے۔ بہر کیف اکبر کو ماضی کی فتوحات اور کارناموں سے کوئی زیادہ لگاؤ نہیں تھا اور نہ ہی وہ مغرب کی جدید ترقیات کی جگمگاہٹ سے زیادہ متاثر یا مرعوب تھے اکبر نے اپنے زمانہ کے مسائل کا مطالعہ کیا اور اپنی استعداد کے مطابق علمی اور عملی طور پر اس کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی ان کی یہ کوشش ان کے سیاسی و ملی شعور کی پوری طرح آئینہ دار ہے بقول ڈاکٹر شوکت سبزواری

• اکبر مغرب کے نقاد تھے انہوں نے مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز کو پرکھا اور اس کا ٹھیک ٹھیک اظہار کیا۔ اس سے زیادہ اکبر نے کچھ نہیں کیا ان کا اصلی کام یہی ہے جس کی طرف اہل علم نے کوئی توجہ نہیں کی [۱]

• اکبر پر ترکِ سعی اور بے عملی کا الزام ہے [۲] حالانکہ اس الزام کی تردید ان کی پوری زندگی اور سعی پیہم سے ہوتی ہے انہوں نے درسِ زندگی دیا ہے کام کرنے کا نعرہ لگایا ہے اور لوگوں کو صحیح راستے پر چلنے کی تلقین کی ہے

---

[۱] اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر ص ۹۰م

[۲] نئی پرانی قدریں ڈاکٹر شوکت سبزواری ص ۱۴۵

اکبر کے اشعار میں یہ درس جگہ جگہ پر ملتا ہے[۱] بقول اکبر مرحوم

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطرافِ دُنیا میں سفر سیکھو
خواصِ خشک و تر سیکھو علومِ بحر و بَر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانو ہوش میں آؤ!
دلوں میں اپنی عزت کو جگہ دو جوش میں آؤ[۲]

۱؎ اکبر و سرسید مضمون ڈاکٹر شوکت سبزواری ص ۱۳۸ کلیاتِ اکبر حصہ چہارم

باب چہارم

سیاسی نظریات پر ایک نظر

فراق گورکھپوری کہتے ہیں۔ " جتنا بڑا شاعر ہوگا اتنا ہی بڑا اس کا یہ احساس ہوگا شاعر کسی غیر مرئی حقیقت اور اس کے پاک اور لامحدود ہونے کے مقابلہ میں محسوسات کی دنیا کی عظمت کا قائل ہوتا ہے شاعر کے مذہب میں ، زمین پاک کا کلمہ پڑھا جاتا ہے ۔ مظاہر فطرت پر اس کا ایمان ہوتا ہے گوشت پوست کی زندگی پر اس کا اٹل عقیدہ ہوتا ہے " [1]

یہ حقیقت ہے کہ یہی احساس زندگی کو حدّت و شدّت عطا کرتا ہے اور پھر ادب اور زندگی کا باہمی رشتہ استوار ہو جاتا ہے بعض لوگ ادب* کو ماورائی حقیقت کا اظہار گردانتے ہیں اور اسے ایک اعلےٰ وارفع دنیا کا نمائندہ قرار دیتے ہیں حالانکہ اس کا تعلق ہمارے حالات اور گرد و پیش سے ایک مسلمہ ادبی حقیقت کے مترادف ہے شاعر اپنے ماحول کی ہر ایک چیز سے متاثر ہوتا ہے اور اسے فنکارانہ اظہار کے قالب میں ڈھالتا ہے اس تعلق کی نوعیت کو ایک انگریزی مفکر فلپ ہنڈرسن اپنی کتاب شاعر اور معاشرہ (THE POET AND SOCIETY) میں یوں واضح کرتے ہیں۔ کہ

---

[1] سویرا لاہور۔ ۱۹۵۷ء ص ۱۳

"So that whether or not literature is one thing and politics another, the writer to day cannot but - deeply concerned with the direction which politics are taking in his time." I

اکبر زندگی کے ترجمان تھے وقت کی سیاسیات اور حالات سے ان کا تعلق مربوط ہے بقول پروفیسر سید عابد علی عابد

"البتہ ہمیں یہ تسلیم کرنے میں باک نہیں کہ اکبر اور اقبال میں یہ شباہت ضرور موجود ہے کہ مقدم الذکر نے تفنن کو سیاسی افکار اور تصورات کا پردہ بنایا تھا اور موخر الذکر نے تغزل کو اسی مقصد کیلئے استعمال کیا" ۲

اسے اکبر کا فن کہیئے یا تفنن ہے؟ یہ الگ ایک ادبی ذمہ داری ہے البتہ یہ حقیقت تو عابد صاحب نے بھی تسلیم کی ہے کہ اکبر نے سیاسی افکار و تصورات کو پیش کرنے کے لئے تفنن کو پردہ سخن کیا۔

اکبر کے سیاسی نظریات اس دور کے حالات اور کوائف حالات کا نتیجہ ہیں اور اگر یہ نتائج مرتب صورت میں قوم کے سامنے نہ آتے تو آج ہماری بے راہ روی اپنے معراج کو پہنچ چکی ہوتی بقول ڈاکٹر شوکت سبزواری

"سر سید کی تہذیب کے بعد اگر حالی اور اکبر نہ ہوتے تو قوم کا کیا حال ہوتا اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔" ۳

I The Poet and Society Page 6

۲ شعر اقبال ص ۵۶ بزم اقبال لاہور ۳ نئی پرانی قدریں ص ۱۴۰

اکبر کے یہاں ہمیں دو نظریات جو سیاسی نوعیت کے ہیں مرتب و منظم صورت میں ملتے ہیں پہلا نظریہ احیائے اقدار اور روایات و نظریات کی تقلید کا ہے دوسرا نظریہ ملت کا تصور ہے اکبر مغربی انداز کے تصور قومیت کے قائل نہ تھے۔ پہلا نظریہ کم و بیش اسلامی نظریہ حیات کی پیروی ہے اکبر نے کوئی نیا نظام نئی ترتیب کے ساتھ دیا نہیں بلکہ وہی تصورات اور خیالات ہیں جو آج سے چودہ سو برس پہلے ہادی اسلام نے پیش کئے تھے جسے صحابۂ کرام اور علمائے امت نے رائج اور جاری و ساری کیا اکبر ان عقائد کی ہمہ گیری کے نہ صرف قائل تھے بلکہ ان کی ترویج و اشاعت کے سرگرم حامی تھے۔

مسلمانوں کی پوری تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ امت مسلمہ کو بہت کم اچھے منتظم اور مدبر حکمران ملے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کا نظام حکومت بڑی خوش اسلوبی سے چلتا رہا۔ آخر اسکی وجہ کیا تھی ——؟ صرف یہی کہ مسلمانوں کی زندگیوں میں اسلامی وحدت موجود تھی اور وہ حاکم وقت کو مسلمانوں کا حاکم جان کر اس کے احکام کا احترام کرتے تھے ملی وحدت کا یہ تصور صرف اسلام ہی کا مرہون منت تھا جب تک اسلام کو ہماری زندگیوں میں عمل دخل رہا ہم اپنی وحدت کے نگہبان رہے جب ہمارے حاکموں نے مذہب اور حکومت کو دو الگ چیزیں قرار دے دیا تو زوال نے ہمارا استقبال کیا اور جب تک یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ رہیں ہم بھی سرفراز رہے۔ حکیم الامت حضرت جمال الدین افغانیؒ نے بھی اس کا یہی تجزیہ کیا ہے حالانکہ وہ اس حقیقت کو علم اور سیاست کی اصطلاحوں سے واضح کرتے ہیں ان کے یہاں علم سے مراد نظریات اسلامی ہیں اور سیاست سے مراد جہاں گیری و جہانبانی کے اصول وہ فرماتے ہیں کہ

" یہ اتحاد خاص سیاسی اقتدار کا مظہر ہی نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ متوازی طور پر علمائے کرام عالم اسلام بھی ایک مرکزی تنظیم کی شکل اختیار کریں۔ افغانی کے نزدیک علم اور سیاست کا اتحاد قومی ترقی کے لئے از حد ضروری ہے ملت اسلامیہ کے زوال کا آغاز اس وقت سے شروع ہو گیا جب کہ " خلافت کے رتبہ سے علم کا رتبہ جدا ہو گیا " [1]

اکبر کا نقطہ نظر بھی کم و بیش یہی تھا لیکن فرق یہ تھا کہ اکبر اسی کلئے کی بدولت ایک معاشرے کو اسلامی تعلیمات کا درس دینا چاہتے تھے اور ان کے نزدیک معاشرے کی تشکیل از حد ضروری تھی وہ انفرادی اصلاح کے ذریعہ بڑی سطح پر اصلاح کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رسم و رواج روایات اخلاق اور عقائد بھی کو اپنا موضوع بنایا۔ عام زندگی کی معمولی معمولی جزئیات بھی ان کے ہاں آگئی ہیں انہی جزئیات کی اصلاح سے وہ افراد کی اصلاح چاہتے ہیں اور افراد کی اصلاح سے وہ ایک پاکیزہ معاشرے کی تخلیق کے متمنی ہیں وہ اپنا پیغام مختلف فنی نزاکتوں کے ساتھ دیتے ہیں مثلاً مادی ترقی کے سیلے کے مقابلے میں اسلام کی تبلیغ یوں کرتے ہیں کہ

ع ان کے مضبوط جہازوں کی مددگار ہے آگ
میری ٹوٹی ہوئی کشتی کا سہارا اسلام

انہیں اپنی قوت کے کم ہونے کا احساس ہے لیکن وہ اس سے گھبراتے نہیں ان کے نزدیک اسلام ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جو پوری قوم کو نئی زندگی اور قوت عمل سے سرفراز

---

[1] اداریہ اخبار عروۃ الوثقیٰ منقولہ رسالہ سویرا لاہور ص ۲۷

سکتا ہے اکبر قومی اور اخلاقی جرأت کے احیاء اور بقاء کے حامی ہیں اگر قوم میں اخلاقی جرأت آجائے گی اس کا ضمیر زندہ ہو جائے گا۔ تو قوم کسی بھی محاذ پر شکست نہیں کھائے گی وہ مادی ترقی کی نسبت اپنی توجہ اس ذہنی تنزل اور شکست کی طرف دیتے ہیں جس کی بناء پر پوری قوم ذہنی غلامی نظریاتی کشمکش اور جذباتی ہیجان کا شکار ہو کر انگریز کی دست بستہ غلام بن چکی تھی اس غلامی کا حل اخلاقی بلندی میں مضمر تھا اور ان کے نزدیک یہ اخلاقی بلندی صرف اسلام ہی عطا کر سکتا ہے۔

کتاب دل مجھے کافی ہے اکبر درس حکمت کو
میں اسپنسر سے مستغنی ہوں مل سے مل نہیں سکتا

اسپنسر اور جان اسٹورٹ مل کے نظریات کی ترویج کے ذریعہ سے اکبر کے ہم عصر قوم کو زندگی دینا چاہتے تھے مگر اکبر قوم کے لئے کتاب دل یعنی روشن ضمیری کا درس دیتے ہیں یہ نور باطن کے ترجمان ہیں اور یہ روحانی قوت اسلام ہی کی روحانی قوت ہے۔ بعض لوگ ان خیالات کو جن کی بدولت تزکیۂ نفس اور نور باطن کا درس ملتا ہے ایسے تصوف سے تعبیر کرتے ہیں جو گوشہ نشینی کا درس دیتا ہے غلط فہمی صرف اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ تصوف کی ہماری ہی پود نے اس لئے مخالفت کی کہ یہ انہیں نوفلاطونی اور عجمی تصورات سے مزین تصوف کا نمائندہ نظر آیا حالانکہ خود اکبر ایسے تصوف کے سخت خلاف تھے اور ان کے ہاں تصوف ایک زندہ حقیقت تھی نہ کہ زندگی سے دور لے جانے والی قوت وہ تو زندگی اور اس کے مسائل کو سلجھانے والی ایک چیز تھی اکبر کے عہد میں بعض

مصلحائے قوم نے بجا طور پر یہ نعرہ بلند کیا کہ تصوّف رائج الوقت نے ہماری قوم کے ضمیر کو گھن کی طرح کھایا ہے لیکن ان حقیقت پسند نقادوں کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ ایسے بھی شامل ہو گئے جو سرے سے تصوّف کی حقیقت اور ماہیت کو ہی نہ سمجھتے تھے اور مخالفت برائے مخالفت کی رو میں بہہ گئے تھے اکبر نے ان کے جواب میں تصوّف کی حمایت کی۔

مولوی تھے جو چلے تھے نذر کالج اس سے قبل
خانقاہیں رہ گئی تھیں اب ہے ان کا انہدام
لیکچر و مضمون لکھتے ہیں تصوّف کے خلاف
الوداع اے ذوقِ باطن الوداع اے فیضِ عام

تصوّف کی حمایت پر بعض لوگوں نے اور آج کے کئی روشن خیال نقادوں نے اکبر پر ترکِ سعی کا الزام لگا دیا اور انہیں بے عملی کا نقیب قرار دیا۔ بقول ڈاکٹر شوکت سبزواری۔

"اکبر پر ترکِ سعی اور بے عملی کا الزام لگانے سے بھی ہمارے روشن خیال نقاد نہیں چوکے ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ بیٹھو رہو، اور صبر کرو، کے معلم ہیں یہ تعلیم سب کے لئے نہیں خاص ان لوگوں کیلئے ہے۔ جو ع

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ

والے فلسفے پر عامل ہیں اور جنہیں اتنی بصیرت نہیں کہ وہ اپنے راہبر کو جانیں اور اپنی منزل کو پہچان کر اس کی طرف قدم بڑھائیں یا ان لوگوں کے لئے جو مخالف حالات کی تاب نہ لا کر ہمت چھوڑ بیٹھے ہیں اور اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس

ہیں ایسے لوگوں کے لئے اس سے بہتر اور کوئی تعلیم نہیں ہو سکتی کہ بے سوچے سمجھے غلط پاؤں اٹھانے سے پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا ہزار درجہ بہتر ہے ۔ [1]

اکبر کے پورے کلام میں قوم کیلئے مفید مشورے و پیغامات موجود ہیں جن کا نتیجہ کسی صورت میں بھی ترک سعی نہیں ہو سکتا ان میں صبر و عمل کی تلقین ایک ساتھ چلتی ہے مثلاً سر سید احمد خان مرحوم یہ کہتے تھے کہ سیاسیات وطن سے الگ رہو اور اپنی سماجی حالت ٹھیک کرو اکبر اس کے مقابلے میں جو درس دیتے ہیں ذرا ملاحظہ کیجئے۔

نہ کہہ شمع سے پروانہ دور ہی اچھا
اگر ہے عشق تو قرب حضور ہی اچھا
نہ گھبرا کفر کی ظلمت سے تو اے نور کے طالب
وہی پیدا کرے گا دن بھی کہ جس نے شب پیدا [2]

اب اکبر کا دوسرا بڑا نظریہ قوم اور ملت کے فرق کا ہے اکبر قوم کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے تھے اس کا اظہار انہوں نے اپنے اشعار میں بھی کیا ہے۔ اور اپنی ذاتی تحریروں میں بھی جو خطوط کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں قومیت کے مغربی تصور کا تعارف خود انگریز نے کرایا اور اس تصور کو شہ دی۔ مشرق وسطیٰ میں بھی تصور قومیت کا تعارف اپنی ذاتی اغراض کے پیش نظر کرایا ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان خواہ کسی خطۂ ارض میں کیوں نہ بستے ہوں علاحدہ رہن سہن کیوں

---

[1] نئی پرانی قدریں ص ۱۴۱ [2] خطوط و کتابت اکبر و سر کشن پرشاد ص ۳۲ مکتوب ۱۵

نہ رکھتے ہوں الگ زبانیں کیوں نہ بولتے ہوں اس کے باوجود وہ ایکدوسرے کو اپنا بھائی اور حامی و ناصر سمجھتے رہے ہیں ملت کا تصور اور جذبہ ان کے وجود اور اتحاد کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس کی بدولت ترکی میں مسلمانوں پر اگر کوہ غم ٹوٹا تو ہندوستانی مسلمانوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے مسلمانوں کی ایک متحدہ قومیت کا تصور امتیازِ رنگ و بو نسل اور نسب سے ماورائی تھا زبانیں اور جغرافیائی تقسیم بھی ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکی یورپی اقوام نے اپنی فراست کے تحت یہ بھانپ لیا تھا کہ جلد یا بدیر مسلمانوں کے مقبوضہ علاقے ان کو چھوڑنا ہونگے لہٰذا انہیں ایسی تعلیم دی جائے کہ کل یہ قومیں جو فکری بنیادوں پر ایک ہیں متحد ہو کر ہماری سفاکی کا جواب نہ دے سکیں چنانچہ اس خطرے کو ٹالنے کے لئے ان یورپی حکمرانوں نے اپنے زیر اثر علاقوں میں مغربی طرز کے تصور قومیت کا تعارف کرایا اکبر اس تصور قومیت کو سرے سے مانتے ہی نہ تھے وہ اپنے ایک خط میں (مخدومی) مولانا ماجد کو لکھتے ہیں کہ

"میں خود عجیب دقت میں ہوں پبلک نے فرض کر لیا ہے کہ میں بڑا محب قوم اور اول درجے کا خادم خواہ ہوں حالانکہ میں قوم ہی کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا ــــــــ"[1]

قوم کے وجود کو تسلیم نہ کرنا دو طرح سے ہے اول تو یہ کہ اکبر مغربی طرز کے تصور قومیت کو پسند نہ کرتے تھے دوسری جانب مصلحانِ وقت مسلمانوں کو بلا روک

---

[1] مکتوب بنام مولانا ماجد ۱۰ر جنوری ۱۹۱۹ء الہ آباد

ترک قوم کہتے تھے۔

مغربی تصوّر قومیت میں بھی یہ بات شامل ہے کہ اُسے اقتدارِ اعلیٰ (SOVERINGHTY) حاصل ہو اور وہ اپنے نظریۂ قومیّت کے مطابق رہ رہی ہو۔ جغرافیائی اور لسانی وحدتوں کو بھی اس میں دخل ہو یہ سب باتیں ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوؤں میں موجود نہ تھیں ہم اس نام نہاد قوم کو جمعیت تو ضرور کہہ سکتے ہیں مگر قوم نہیں۔

ملّت کا اسلامی تصوّر آخر کیا ہے جسکو اکبر نے قوم پر ترجیح دی اگر ہم غور کریں تو اس کی جڑیں ہمارے ماضی میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ قرآن حکیم میں قوم کا لفظ بھی آیا ہے اور ملّت کا بھی ـــــ ملّت کا لفظ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروؤں کے لئے استعمال ہوا ہے اور قوم کا لفظ اس کے علاوہ تمام گروہوں کے لئے [1]

قوم کا لفظ قومِ عاد اور قومِ ثمود کے لئے بھی استعمال ہوا ہے مگر صرف پہلی اور آخری مرتبہ ملّت کا لفظ خدائے بزرگ و برتر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے لئے استعمال کیا ملت، قوم سے ان معانی میں بلند و برتر ہے کہ اس میں قومیت کے جغرافیائی اور لسانی تصوّرات سے آزادی اور بلندی پائی جاتی ہے۔ اس کا تعلق ہمارے نظریۂ حیات سے ہوتا ہے۔ حیات ازلی و ابدی کے اصول اسمیں بیان کئے گئے

---

[1] مثلاً پارہ نمبر ۳ رکوع نمبر ۶ میں ارشادِ ربّانی ہوتا ہے

وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

رہوتے ہیں دنیا میں صرف دو قومیں ایسی ہیں جن کے یہاں بیسویں صدی میں بھی جو انقلابات کا دور ہے ملت کا تصور ہمیں ملتا ہے ملت کا یہ تصور ہمیں مسلمانوں کے علاوہ یہودیوں میں ملتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اسرائیل کی ریاست کی بنیاد یہودیوں کے تصور ملیہ کی آئینہ دار ہے ورنہ ایک قوم کے عناصر تو یہودیوں کی معجون مرکب کے یہاں موجود نہ تھے کوئی روس کا باشندہ تھا تو کوئی امریکہ کا ان کے عادات و خصائل رہن سہن زبان بیان میں بعد مشرقین تھا مگر ان کو متحد کرنے میں ان کے تصور ملت کا نمایاں ہاتھ ہے یہی وجہ ہے کہ آج بھی یہودیوں کی یہ ملت اپنی جگہ پر ملت کا اصلی اور ابدی تصور رکھنے والوں سے زیادہ طاقت ور ہے افسوس تو یہی ہے کہ مسلمانوں کے یہاں ملت کا یہ تصور آئے دن کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے ہمیں اب بھی اس کمزوری کا احساس نہیں ہم میں سے کوئی تو عرب نیشنلزم کا حامل ہے تو کوئی پراگریسیو مسلم بلاک کے خواب دیکھتا ہے مگر ملت کا قیام ہی ہماری بقائے دوام کا باعث بن سکتا ہے ورنہ تسبیح کے یہ دانے بکھر جائیں گے اور ان کو متحد کرنے والی قوت نہ رہے گی۔

اکبر ملت اسلامیہ کے احیا اور اسکی بقا کے خواہشمند اور حامی تھے کیونکہ ملت نسبتاً زیادہ وسیع اصطلاح ہے اور اس میں علاقائی حد بندیوں کو دخل نہیں ہے اس کا تعلق براہ راست ہمارے نظریۂ حیات سے ہے اور ہمارا نظریہ حیات قطعاً بتانِ رنگ و بو میں گم نہیں ہوتا اسی لئے تو اکبر کہتے ہیں

بعد مردن کچھ نہیں یہ فلسفہ مردود ہے
قوم ہی کو دیکھئے مردہ ہے اور موجود ہے

اس سے اکبر کی مراد یہ ہے کہ لوگ قومیت کا راگ الاپتے ہیں قومیت کا نعرہ لگاتے ہیں قومیت کے عناصر ترکیبی میں سے اکثر موجود ہیں مگر پھر بھی زندہ قوم کا وجود مفقود ہے؟ اسلئے اس فلسفے کو مردود کہا جاسکتا ہے اسی طرح اکبر اس امر کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں کہ نئی قوم جو علیگڑھ میں پرورش پا رہی ہے اسکی کی حقیقت اور حیثیت کیا ہے اسکے رُخِ پُر فریب سے اکبر یوں نقاب کشائی کرتے ہیں

دیکھ آئے قوم سنتے تھے جسے
چند لڑکے ہیں مشن اسکول کے
ہے یہی ان کی ترقی کا مدار [1]
رہ گئے ہیں گملوں ہی میں پھول ایسے

گملوں میں پھول کے جانا کتنی بلیغ بات ہے کہ اس نئی قوم کا نہ کوئی مرکز ہے اور نہ ماخذ اور نہ ہی اسکی بنیادیں ہماری تاریخ و روایات سے مربوط ہیں بلکہ اسکی حیثیت کو گملوں میں لگائے ہوئے پھولوں کی سی ہے جن کی نشو و نما محدود ماحول کی مرہونِ منت ہے اکبر نے اس نام نہاد تصورِ قومیت کا پردہ بھی چاک کیا ہے۔ اور درسِ حکمت بھی دیا ہے۔ المختصر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اکبر کی شاعری میں ہمہ گیریت اور زندگی کی رو پائی جاتی ہے۔ اکبر ہماری تحریکِ آزادی کی ایک کڑی ہیں اس کو اگرچہ آج بھی بعض لوگ جھٹلاتے ہیں پھر بھی ان کے گو مگو انداز سے اکبر کی خدمات ہمارے سامنے آجاتی ہیں بقول پروفیسر سید وقار عظیم

---

[1] یہ مصرعہ مختلف نسخوں میں کچھ اور طرح سے چھپا ہے یہاں کلیات اکبر بزم اکبر کو اولیت دی گئی ہے

"انگریز نے آزادی افکار کا گلا جس طور سے گھونٹا ہے اس کے شدید احساس کے وجود انہیں اس بات پر فخر ہے کہ وہ مداری کے مجبور کرنے پر بھی رقص بوزنہ پر آمادہ نہیں ہوئے" [1] اپنی صفائی میں کہتے ہیں کہ

شاگرد ڈاروِن تو خدا ہی نے کر دیا
اکبر مگر نہیں ہے مداری کے ہاتھ میں

اور شاید یہی آزادی نفس ہے کہ انگریز کے متعلق انہوں نے جو کچھ کہا ان کے دل کی بات سے زیادہ دوسرے دل کی بات بن گئی اور اس کی کشش اور اثر انگیزی کل سے زیادہ آج ہے۔ اور آج سے زیادہ کل ہو گی اسکے آثار ظاہر ہیں" [2]

انہیں بجا طور پر محسنِ ملت اسلامیہ کہا جا سکتا ہے اور بقول فراق گورکھپوری ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ۔

"اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وطن پرستی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی [3]

آخر میں ہم فراق صاحب ہی کے الفاظ میں اکبر کو خراج عقیدت ادا کرتے ہیں کیونکہ یہ ایک صاحب نظر شاعر ادیب نقاد اور فنکار کا نذرانہ عقیدت ہے

تری نوا سے حکومت کو خوف تھا کہ کہیں
دلوں میں آگ لگا دے نہ شعلۂ غیبی

---

[1] ماہ نو مارچ سنہ ۶۲ء صہ ۴۰ .

[2] اکبر اور انگریز سید وقار عظیم مطبوعہ ماہ نو کراچی

[3] ماہنامہ پھلجھڑی دسمبر سنہ ۶۰ء صہ ۱۶۱

ہوًا نہ وقت کے دامن نے کھل کے دی اسکو
کہ انقلاب کی چنگاریاں تھیں اس میں دبی

نئی زمین نیا آسماں نئی دُنیا
نئی ہے محفلِ ساقی نئے ہیں جام و سبو
یہ سب سہی مگر اے جرعہ نوشِ بادۂ ہند
ہنا رُلا کے ہمیں دے گیا بہت کچھ تو [۱]

---

۱ قطعاتِ فراق ماہنامہ پھلجھڑی دسمبر ۶۰ء ص ۱۶۲

اکبر الہٰ آبادی کا سیاسی شعور

ارشاد حسین نقوی

ذخیرہ کتب: محمد احمد ترازی